انجم کدہ

[مجموعۂ غزلیات]

عزیز لکھنوی

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

قیمت ٣/-

مارچ ١٩٥٩ء

مطبوعہ سرفراز پریس، لکھنؤ

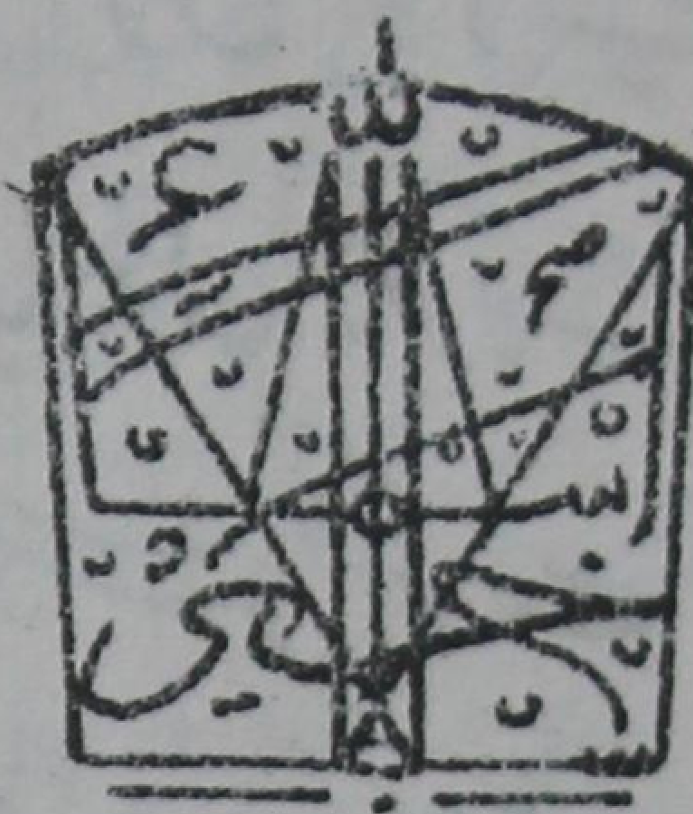
پیش لفظ

یہ مجموعہ جو نذرِ ناظرین کیا جا رہا ہے، حضرت والد ماجد لسان الہند مولانا میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی اعلی اللہ مقامہ کے غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مطبوعہ کلام کے سوا جو کچھ ہے وہ صرف یہی ہے، اس مجموعے میں تو صرف غزلیات ہیں، وہ بھی سب نہیں۔

ان کے علاوہ علمی، ادبی، اصلاحی، قومی، مذہبی نظمیں اور رباعیات و قطعات بہت ہیں، جن میں سے چند نظموں کا مجموعہ "نالۂ جرس" کے نام سے زیرِ طبع ہے اور انشاء اللہ عنقریب شایع ہو جائے گا، لیکن سب مل کر بھی تمام تصانیف کا احاطہ نہیں کرتیں۔

"انجم کدہ" کے متعلق بلکہ معتبر ترین ذرائع سے یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ حضرت والد علام کی تمام غزلیات کا جو ایک مرتب ذخیرہ تھا، جناب مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی مغفور کے پاس مقدمہ نویسی کے لیے لاہور بھیجا گیا تھا، یہ اطلاع جناب منیر آغا صاحب اشہر (تلمیذ مصنف) نے حضرت والد ماجد سے اس وقت حاصل کی جب وہ بسترِ مرگ پہ تھے، بہرحال ہمیں اب تک ان ادبی اور علمی کارناموں کی جستجو ہے اور شاید جیتے جی رہے گی، ممکن ہے کہ کبھی ان کوششوں میں انشاء اللہ کامیابی ہو۔

خیر! ۲۶ جولائی ۱۹۳۵ء کو میرے پدر بزرگوار نے رحلت فرمائی، میرا سن اس وقت تقریباً



(۱)

دل صد پارہ ایک بسمل کا
آئینہ ہے فروغ محفل کا

کون اُٹھا یہ جھاڑ کر دامن
ہے دگرگوں جو رنگ محفل کا

شوقِ دل بڑھ گیا ہے حد سے سوا
فاصلہ گھٹ گیا ہے منزل کا

اہلِ محفل سے ہے گِلا بے سود
مجھ کو شکوہ ہے میر محفل کا

دونوں عالم کی قوتیں مل کر
کر تو لیتیں مقابلہ دل کا

حال تیرا عزیز کون سُنے
رنگ بدلا ہوا ہے محفل کا

(۲)

جلتے ہیں کیسے، ایسی مثالوں کو دیکھیے
پردہ اُٹھا کے چاہنے والوں کو دیکھیے

کیا دل جگر ہے چاہنے والوں کو دیکھیے
میرے سکوت اپنے سوالوں کو دیکھیے

اب بھی ہیں ایسے لوگ کہ جن سے سبق ملے
دل مردہ ہے تو زندہ مثالوں کو دیکھیے

کیا دیکھتے ہیں آپ بہارِ نمو ابھی
جب ایڑیوں تک آئیں تو بالوں کو دیکھیے

طبقے زمین کے ہوں کہ اوراقِ آسماں
قدرت کے دل فریب رسالوں کو دیکھیے

ہمت کو دیکھیے کہ وہی مردِ کار ہے
فوجوں کو دیکھیے نہ رسالوں کو دیکھیے

تقلید کیوں خیال و زباں میں کسی کی ہو
اپنے خیال اپنے مقالوں کو دیکھیے

دشمن پہ بھی نگاہ رہے، عیب بیں ہے وہ
یہ کیا کہ صرف چاہنے والوں کو دیکھیے

ہو تیر تیری نہ گورِ غریباں پہ اک نظر
اُن کے دماغ ان کے خیالوں کو دیکھیے

ساقی کی چشمِ مست کا نظارہ کیجیے
صہبا کو دیکھیے نہ پیالوں کو دیکھیے

دل دیکھیے کہ تکملۂ شوق ہو عزیز
مسجد کو دیکھیے نہ شوالوں کو دیکھیے

(۲)

بتاؤں کیا کہ میرے دل میں کیا ہے
سوا تیرے تری محفل میں کیا ہے

یہاں بھی تجھ کو تنہا میں نے پایا
تو ہی تو ہے، بھری محفل میں کیا ہے

کسی کے بجھتے دل کی ہے نشانی
چراغ سرحدِ منزل میں کیا ہے

بجز نقشِ پشیمانیِ قاتل
نگاہِ حسرتِ بسمل میں کیا ہے

جفاؤں کی بھی حد ہوتی ہے کوئی
خدا معلوم اُس کے دل میں کیا ہے

مآلِ ہستی موہوم معلوم
عزیز اِس شغلِ لاحاصل میں کیا ہے

(۴)

یکم جنوری ۱۹۱۹ء

ایک ہی خط میں ہے کیا حال جو مذکور نہیں
دل تو دل، عشق میں سادہ ورق طور نہیں
ایک ہم ہیں کہ کسی بات کا مقدور نہیں
ایک وہ ہیں کہ کسی رنگ میں مجبور نہیں
امتحاں گاہِ محبّت نہیں گُلزارِ خلیل
کون ایسا ہے جو زخموں سے یہاں چور نہیں
نزع کا وقت ہے، بیٹھا ہے سرھانے کوئی
وقت اب وہ ہے کہ مرنا ہمیں منظور نہیں
قابلِ غور ہے اے جلوہ پرستانِ ازل
یہ کہانی ہے مری، واقعۂ طور نہیں
مصر کا چاند ہو آغوش میں زنداں کے طلوع
فطرتِ حُسن بدل جائے تو کچھ دُور نہیں
سر جُھکائے درِ دولت سے پلٹنے والے
بے نیازی کی ادائیں ہیں، وہ مغرور نہیں
جبہہ سائی بھی گوارا نہیں کرتا کوئی
اُٹھ کے جانا درِ دولت سے بھی دستور نہیں

عشق میں سرحدِ منزل سے کچھ آگے ہوں، مگر
اس کا رونا ہے کوئی سعی بھی مشکور نہیں

دل میں پیوست ہوئی تھی جو مرے روزِ ازل
ہے وہی شوخ نظر، صاعقۂ طور نہیں

دل کو بھی دی گئی ہے خدمتِ دردِ ابدی
صرف آنکھیں ہی مری رونے پہ مامور نہیں

سرِ مژگاں مرے آنسو کا ستارہ چمکا
دار پر اب اثرِ جذبۂ منصور نہیں

صاد سُرخی سے کیا کس نے سرِ فردِ جمال
اپنے عالم میں ترے دیدۂ مخمور نہیں

زندگی ختم ہوئی جب تو اک آواز سُنی
آگیا میں ترے نزدیک، بس اب دور نہیں

روح کہتی ہوئی نکلی ہے دمِ نزع عزیزؔ
اُن سے اِس بزم میں ملنا ہمیں منظور نہیں

(۵)

فنا آسودہ ہونا عاشقی میں سخت مشکل ہے
کہ پہلے ایک تھا دل، اب ہر اک ذرّہ نیا دل ہے

اِسے اَے ساربان! جذباتِ باطن کھینچ سکتے ہیں
زمامِ ناقۂ لیلیٰ بھی مجنوں کی رگِ دل ہے

نقاب اُٹھو گے تم اور دیکھ لیں گے دیکھنے والے
یہ وہ باتیں ہیں جن کا کوئی قائل تھا نہ قائل ہے

اِسی کو حشر کہتے ہیں جہاں دُنیا ہو فریادی؟
یہی اَے میر دیوان جزا کیا تیری محفل ہے؟

مری بیتابیوں سے تم بہت ناراض رہتے تھے
لحد تک اب چلے آؤ کہ ساکن مضطرب دل ہے

نگاہِ عشق پر کیا حُسن کی صیقل مدد دے گی
تجلیٔ برقِ ہستی سوز کی تہ مقابل ہے

نقابِ رُخ اُلٹتے ہیں وہ، دل کے داغ مٹتے ہیں
طلوعِ مہر ہے اور ڈوبتے تاروں کی محفل ہے

کروگے قتل ہم کو اور ہمیں سے خوں بہا لوگے
خدا رکھے تمہیں تم ہو اب ایسا کون قاتل ہے

یہ ذرّے خاکِ دل کے سیکڑوں عالم بتائیں گے
اِسی دُنیا میں ہیں، دُنیا اگر خود ان میں داخل ہے

شکنجے میں فلک نے کس دیا ہے غم نصیبوں کو
مریں کیونکر کہ اب دم توڑنا بھی سخت مشکل ہے

یہ رسمِ بادہ خواری ہے دِلا ے ساقیِ کوثر
یہ پیمانِ ازل تھا جو مری فطرت میں داخل ہے
سلام آخری اَے ساکنانِ کوچۂ جاناں!
ہماری اور منزل ہے تمھاری اور منزل ہے
نگاہیں چند ازل کے روز تو نے مجھ پہ ڈالیں تھیں
انھیں کا ایک مجموعہ ہے جو اب مستقل دل ہے
سُنو ٹوٹی ہوئی قبروں سے پچھلی داستانوں کو
جہاں خاموشیاں کرتی ہیں باتیں، یہ وہ محفل ہے
نثار اس رسمِ غم خواری کے شرمانے سے کیا حاصل
سرہانے بیٹھنے والے! ترا بیمار غافل ہے
رِدائے کعبہ کے ہر تار سے خوں آج ٹپکے گا
عزیز آمادہ فریادِ زخمِ پردۂ دل ہے

(۶)

مارچ ۱۹۱۹ء

خبر دی طور نے موسےٰ کو ان کے عشقِ پنہاں کی
تجلّی برق کی تمہید تھی چاکِ گریباں کی
جنونِ غم کی آزادی بھی پابند محبت ہے
مری خودداریاں مجھ کو خبر دیتی ہیں زنداں کی

نگاہِ شوخ ان کی اب ترقی کرتی جاتی ہے
حدیں تو کھینچ دوں عالم میں اُٹھ کر میں بیاباں کی
ابھی آمادۂ عبرت نہیں، یہ محو خود داری
ہُوا دل کو کِھلا لاؤں زرا گورِ غریباں کی
نظامِ عالمِ ہستی کے عقدے کون کھولے گا
مگر اک آخری ہچکی ترے بیمارِ ہجراں کی
عزیز ایسی ہزاروں منزلیں ہیں دشت اُلفت میں
قیامت تو ابھی اک ابتدا ہے اس بیاباں کی

(۷)

۲۹ر مارچ ۱۹۱۹ء

بھڑک اُٹھیں گے شعلے ایک دن دُنیا کی محفل میں
کہاں تک جذب ہوں گی بجلیاں صبر آزما دل میں
لہو رونے لگیں گے سازِ عشرت چھیڑنے والے
ارے یہ درد، آوازِ شکست شیشۂ دل میں
یہ چھینٹیں خون کی کافی ہیں میرے بخشوانے کو
نظر آتی ہے جنت وسعتِ دامانِ قاتل میں
ابد تک کوکبِ بختِ سعادت بن کے چمکیں گے
ہوئے ہیں جذب جو قطرے لہو کے تیغِ قاتل میں

جنونِ بے سر و ساماں کی زینت دیکھنے والے
مبادا فرق آئے عشق کی تدبیرِ منزل میں
ہزاروں سال سوزِ دل نے کی تھی دُو نرخ آشامی
قدم رکھتے ہی میرے لگ گئی اک آگ محفل میں
مگر بھولے نہیں ہو یاد اب تک آبرؔ و حامدؔ کی
عزیزؔ آخر وہ قوت کیوں نہیں باقی رہی دل میں

(۸)

۸ جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

ہجر کی رات یاد آتی ہے — پھر وہی بات یاد آتی ہے
تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی — بات پر بات یاد آتی ہے
تم تھے اور ہم تھے، چاند نکلا تھا — ہائے وہ رات یاد آتی ہے
صبح کے وقت ذرّے ذرّے کی — وہ مناجات یاد آتی ہے
ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی — اب تو دن رات یاد آتی ہے

مے سے توبہ تو کی عزیزؔ مگر
اکثر اوقات یاد آتی ہے

سلہ آبرؔ۔ حکیم محسن خاں مرحوم ۔۔۔۔۔۔ } احباب مصنف
سلہ حامدؔ۔ حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا } احباب مصنف

(٩)

یکم اگست ۱۹۱۹ء

اے سوزِ عشقِ پنہاں ! اب قصّہ مختصر ہے
اِکسیر ہو چلا ہوں ، اِک آنچ کی کسر ہے
تیغوں کی دھار پر یوں کورانہ راہ چلنا
یہ جادۂ وفا ہے ، اے دل بڑا خطر ہے
خاموش اس سے رہتا ، اے کاش دل ہمارا
ہر نالہ نارَسا ہے ، ہر آہ بے اثر ہے
معلوم ہو چکا ہے ، دُنیا کا راز پھر بھی
ہم ہیں کہ مستِ غفلت ، دل ہے کہ بے خبر ہے
ہے دل میں اِک تمنّا ، کہنا ہے جو تمہیں سے
سُن لو مری زبانی ، اب قصّہ مختصر ہے
دورِ حیات کتنا ، گھبرائیں کس لیے ہم
یہ داستانِ ہستی ، دم بھر میں ختم پر ہے
جلوہ دکھا رہی ہے ، قدرت نقاب اُٹھائے
طائر چہک رہے ہیں ، ہنگامۂ سحر ہے
وہ اک خلش سی دل میں ، محسوس کر رہے ہیں
شاید مریضِ غم کی ، یہ آخری نظر ہے

حالِ عزیزِ مے کش، ہم مشربوں سے پوچھو
اِک رندِ لاابالی، اِک مستِ بے خبر ہے

(۱۰)

۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء

دل آیا اس طرح آخر فریبِ ساز و ساماں میں
اُلجھ کر جیسے رہ جائے کوئی خوابِ پریشاں میں

یہ مانا ذرے ذرے پر تمھاری مہر ازل سے ہے
مگر کیا میری گنجائش نہیں شہرِ خموشاں میں

پتہ اس کی نگاہِ وحشت افزا کا لگاتا ہے
نگاہیں وحشیوں کی دیکھتا پھرتا ہوں زنداں میں

یہی ہے روح کا جوہر، تم آؤ گے تو نکلے گا
دمِ آخر رُکا ہے ایک آنسو چشمِ گریاں میں

مری جمعیتِ خاطر کا ساماں حشر کیا کرتا
قیامت ہو گئی ترتیبِ اجزائے پریشاں میں

فروغِ لالۂ و گل کا تماشا دیکھنے والے
یہ میرے دل کی چوٹیں ہیں جو اُبھری ہیں گلستاں میں

عزیزؔ آرائشِ گلشن کی کوئی انتہا بھی ہے
وہ محوِ سیرِ گل ہیں یا گلستاں ہے گلستاں میں

(۱۱)

۱۰ر جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

انتہائے عشق ہو، یوں عشق میں کامل بنو
خاک ہو کر بھی نشانِ سرحدِ منزل بنو
میرے شکووں پر یہ کہنا رحم کے قابل بنو
مُدّعا یہ ہے کہ اپنے حال سے غافل بنو

غرق ہو کر دل کا موتی خود اپنے واسطے
ڈوب کر اُبھرو تو اوروں کے لیے ساحل بنو
انجمن کیسی، تم اپنی ذات سے ہو انجمن
گوشۂ خلوت میں بھی بیٹھو تو اک محفل بنو

حُسن خود بیں معجزاتِ عشق کا قائل نہیں
قطرہ ہائے اشکِ خونیں جمع ہو کر دل بنو
ساتھ آزادی کے خود داری بھی رہنا چاہیے
بحرِ بے پایاں، کبھی لبِ خشکیِ ساحل بنو

علم کا ذرہ لہو کے ساتھ رگ رگ میں رہے
جوہرِ قابل اگر ہو قوّتِ عامل بنو
شرم سے تم کو سمٹنا ہے تو سمٹو حُسن سے
دل میں بن جاؤ سویدا، پتلیوں میں تِل بنو

ربطِ باطن کیا، سُنو تفصیل اس اجمال کی
ہم سراپا درد ہوں اور تم سراپا دل بنو

جلنے والو! تا بہ اِمکاں ضبطِ سُوزِ غم کرو
آگ جب بھڑکے چراغِ سرحدِ منزل بنو

کچھ دنوں بیٹھو سرِ قبرِ عزیزِ بے نوا،
خانقاہوں میں بہت دشوار ہے کامل بنو

(۱۲)

۱۰؍ فروری ۱۹۲۰ء

اس وہم کی انتہا نہیں ہے
سب کچھ ہے، مگر خدا نہیں ہے

کیا اس کا سُراغ کوئی پائے
جس چیز کی ابتدا نہیں ہے

کُھلتا ہی نہیں فریبِ ہستی
کچھ بھی نہیں اور کیا نہیں ہے

اس طرح ستم وہ کر رہے ہیں
جیسے میرا خدا نہیں ہے

تم خوش ہو تو ہے مجھے ندامت
ہر چند مری خطا نہیں ہے

دیکھو تو نگاہِ واپسیں کو
اس ایک نظر میں کیا نہیں ہے

دُنیا کا بھرم نہ کھول اے آہ
یہ راز ابھی کُھلا نہیں ہے

ہر ذرّہ ہے مشاہدِ تجلّی
اس حُسن کی انتہا نہیں ہے

سرگرمِ تلاش رہنے والے
تیرا بھی کہیں پتا نہیں ہے

اُمڈا ہے جو دل عزیزؔ رو لو
آنسو کوئی روکتا نہیں ہے

(۱۳)

۱۵/ فروری سنہ ۱۹۲۰ء

کوئی ارماں نکل نہیں سکتا ‏ ‏ دل کا عالم بدل نہیں سکتا
نفس کہتا ہے بارِ عصیاں سے ‏ ‏ اب تو لنگر سنبھل نہیں سکتا
اہلِ عرفاں کا ظرف عالی ہے ‏ ‏ دل کا چشمہ اُبل نہیں سکتا
آنے والے کہاں تک اب تاخیر ‏ ‏ موت کا وقت ٹل نہیں سکتا
دل نکل آئے، سینہ شق ہو جائے ‏ ‏ دل کا کانٹا نکل نہیں سکتا
سعیِ اخفائے راز نے مارا ‏ ‏ کفِ افسوس مل نہیں سکتا
آتشِ عشق بھی کرامت ہے ‏ ‏ جلتا رہتا ہوں جل نہیں سکتا

سر سے پا تک اِک آبلہ ہوں عزیزؔ
اب تو کروٹ بدل نہیں سکتا

(۱۴)

۲۲/ فروری سنہ ۱۹۲۰ء

بازیِ عشق ہر کے بیٹھے ہیں ‏ ‏ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے ہیں
ہم ہیں اور گریۂ خونیں دن رات ‏ ‏ پھول دامن میں بھر کے بیٹھے ہیں
دل میں آ کر رہیں ہیں نظر سوئے فلک ‏ ‏ تیر ترکش میں بھر کے بیٹھے ہیں
میں بھی ہوں جان سے اپنی بیزار ‏ ‏ وہ بھی غصے میں بھر کے بیٹھے ہیں
کر چکے چاک گریباں جب سے ‏ ‏ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے ہیں

میری میت کے سرہانے وہ عزیز
اشک آنکھوں میں بھرے بیٹھے ہیں

(١٥)

٢٣ فروری ١٩٢٠ء

ساقیِ روزِ ازل یہ کیا پلایا تھا مجھے
کچھ خبر بھی ہے تجھے، کب ہوش آیا تھا مجھے

شبنم آلودہ کلی ہوں، جوشِ حسرت دل میں ہے
اب ہنسائے بھی وہی جس نے رُلایا تھا مجھے

دل کی کوشش سے حیاتِ جاودانی مل گئی
آپ نے تو آپنے امکاں بھر مٹایا تھا مجھے

ذرّے ذرّے میں رہے گی ایک روحِ مضطرب
خاک میں کیوں اپنے ہاتھوں سے ملایا تھا مجھے

اے خیالِ زلفِ جاناں زندگی تیری دراز
سخت ناکافی شبِ فرقت کا سایا تھا مجھے

میں اسی دن حُسن کی شوخی کا قائل تھا عزیز
اُس نے جس دن خاک کا پتلا بنایا تھا مجھے

---

(۱۶)

۱۰ر مئی سنہ ۱۹۲۰ء

کرنا ہے اپنے حال میں یہ شب بسر مجھے
اب آکے دیکھے گا قریب سحر مجھے

کہہ دو کہ میں ہوں اور ہے اک عالم وصال
مردہ سمجھ رہے ہیں یہ کیوں نوحہ گر مجھے

جلووں کو اُن کے شوق کا پیدا کروں حجاب
دیکھوں تو کیا دکھائے یہ ذوقِ نظر مجھے

شاہد ترے وجود پہ ہے میری بے خودی
میں ہوں اگر تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے

یہ کم نگاہیاں تری ساقی رہیں گی یاد
ساغر پلا ہے بزم میں سب کو، مگر مجھے؟

اک آہ بھر کے اب نہ کہوں گا کسی سے کچھ
کرنا ہے آج قصۂ غم مختصر مجھے

کوئی قصور میری نظر کا نہیں عزیز
مجبور کر رہی ہے کسی کی نظر مجھے

(۱۷)

۴ر جولائی ۱۹۲۰ء

ہو گا ہر حال میں جو عشق کی تقدیر میں ہے
کارکنِ حُسنِ ازل پردۂ تدبیر میں ہے
خوابِ ہستی کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر
دل کی غفلت، کہ ابھی حسرت تعبیر میں ہے
دونوں عالم کو جو تقسیم ہوا رُوزِ ازل
وہ اثر ایک مرے نالۂ شب گیر میں ہے
بزمِ ہستی میں ضروری ہے کوئی رُوحِ رواں
ایک جنبش سی جو اِس پردۂ تصویر میں ہے
سنگ بنیاد وہ دل ہے حرکت جس کی حیات
ابتدا ہی سے خرابی مری تعمیر میں ہے
سخت ہے مجرمِ ہستی کی سزا اے مالک
میری رگ رگ مجھے جکڑے ہوئے زنجیر میں ہے
حرف آلودہ بہ خوں، گوش بہ آواز جہاں
پوچھتے کیا ہو، اثر جو مری تقریر میں ہے
بزمِ ہستی کا مٹانا ہی مگر ہے منظور
مصلحت کوئی ضرور آپ کی تاخیر میں ہے

میرے غم کی یہ حقیقت ہے کہ روزِ خلقت
جو کسی نے نہ لیا وہ مری تقدیر میں ہے

وقت ضایع نہ کرو ہرزہ سرائی میں عزیزؔ
سوز پیدا وہ کرو جو سخنِ میرؔ میں ہے

(۱۸)

۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء

دوں گا متاعِ نورِ دل ظلمتِ پردہ پوش کو
دو یہ نویدِ جاں فزا زلفِ شکن فروش کو

سرِ ازل نہیں مگر ہے کوئی ربطِ باہمی
تیری نگاہِ ناز سے میرے لبِ خموش کو

مجلسِ وعظ کا مآل ترکِ شراب ہے اگر
میرا سلام آج سے واعظِ خرقہ پوش کو

پی کے سحر کو جام مے اہلِ ولا کو مست کر
مے کدۂ اثر بنا نرگسِ مے فروش کو

تیرے ہی نام پر ہو بند، تیرے ہی نام پر کھلے
قفلِ حریمِ دل بنا میرے لبِ خموش کو

زخمِ دلِ عزیزؔ اگر بڑھ کے دکھائیں فصلِ گل
خونِ بہار نذر دے اپنے نمو کے جوش کو

(۱۹)

۱۵/ دسمبر ۱۹۲۰ء

تفاوت طبیعت میں ہے رات دن کا
وہ عالم نہیں اب دلِ مطمئن کا
کسی وقت رونے سے فرصت نہیں ہے
یہی مشغلہ رہ گیا رات دن کا

نہ گھبراؤ ٹوٹے گی مہرِ خموشی
ابھی منتظر ہوں قیامت کے دن کا

وہ دُنیا کے ہوش و حواس اب کہاں ہیں
اثر عشق کا ہے تقاضا ہے سن کا

بہار آئی پھولوں کا عالم نہ پوچھو
جوانی ہے اِن کی، زمانہ ہے اِن کا

سرِ طور جو برق بن کر گرا تھا
وہ میرے نشیمن کا تھا ایک تنکا

ابھی منھ چھپائے ہوئے جو گئے ہیں
عزیزِ وفا کیش کشتہ ہے ان کا

---

(۲۰)

۲۲ جنوری ۱۹۲۱ء

تیرے فراق سے مری ہستی تباہ ہے
میرا وجود میرے لیے اک گناہ ہے

وجہ خلش ہے نقش سویدا سے آشکار
کانٹا چبھا ہے یا یہ کسی کی نگاہ ہے

کھولی ہے کس نے زلف کہ میری نگاہ میں
عالم تمام موجۂ دودِ سیاہ ہے

کنعاں میں جس کے حسن کی پھیلی تھی روشنی
زنداں کا چاند آج وہ نور نگاہ ہے

ہے بس حقیقتِ دلِ زخمی اسی قدر
گلدستۂ بہار، فریبِ نگاہ ہے

دُنیا کو جانتا ہوں میں اِک فردِ معصیت
جب ہر وجود اس میں سراپا گناہ ہے

آساں نہیں ہے بُت کدۂ دہر سے عُبور
ایک ایک گام پر کوئی بُت سنگِ راہ ہے

گنجائش ایک تل میں کہاں تیرے حُسن کی
نظارہ جمال سے قاصر نگاہ ہے

لکھ دو زمانے بھر کی خطائیں مرے یہاں
آخر تو فردِ میرے عمل کی سیاہ ہے

یہ مُنھ چھپائے جاتے ہیں جو سوئے میکدہ
مجھ سے کبھی اِن جناب سے کچھ رسم و راہ ہے

باتوں سے میری ہوگا وہی کچھ اَثر پذیر
جو آشنائے زمزمۂ خانقاہ ہے

دل میں ہے کچھ نظر سے ٹپکتا ہے اور کچھ
کتنی زمانہ ساز تمھاری نگاہ ہے

ایوانِ رحمتِ ازلی تک تو جا ذرا
آواز آرہی ہے، کوئی داد خواہ ہے؟

میں کیا ہوں ایک شعلۂ جاں سوزِ عشق ہوں
دل کیا ہے، اِک نشانۂ تیرِ نگاہ ہے

قبرِ عزیز دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ دل
یہ تو کسی شہید کی آرام گاہ ہے

گُل پوشِش بلبلوں نے کیا مشہدِ عزیزؔ
یہ عافیت نصیب شہید نگاہ ہے

(۲۱)

۲۹ر جنوری ۱۹۲۷ء

لو مرادِ ساکنِ بیت الحزن آ ہی گئی
لے کے نورِ آنکھوں کا بوئے پیرہن آ ہی گئی

وادیِ غربت میں بھی یادِ چمن آ ہی گئی
لے کے بادِ صبح پیغامِ وطن آ ہی گئی

گو ذری بیٹھے رہیں اُمیدِ فردا کے لیے،
میرے ہونٹوں تک شرابِ موج زن آ ہی گئی

حُسن نے اپنی نگاہوں کی حفاظت کی بہت
پُھوٹ کر پردوں سے دل تک اک کرن آ ہی گئی

یہ چمن کی نوجوانی، یہ گھٹاؤں کا ہجوم
ساقیا! یاد آج وہ رسمِ کہن آ ہی گئی

دل کو ان تاروں بھری راتوں نے بہلایا بہت
پھر بھی غربت میں مجھے یادِ وطن آ ہی گئی

کِس نے یہ تیوری چڑھا کر غور سے دیکھا مجھے
جامۂ ہستی پر آخر اک شکن آ ہی گئی

حق پسندی شیوۂ منصور، دُنیا اس سے دور
رفتہ رفتہ نوبتِ دار و رسن آ ہی گئی

مجھ تھا آرائشِ شامِ جوانی میں عزیز
صبحِ پیری لے کے کافور و کفن آ ہی گئی

(۲۳)

۸ر فروری سنہ ۱۹۲۱ء

پرسش بھی ہے تو کس ستم دل پذیر سے
سینے میں دل کو دیکھتے ہیں نوک تیر سے

چھیڑو نہ قصۂ دلِ محرومِ عافیت
پوچھو قفس کا حال نہ مرغِ اسیر سے

پردہ اُٹھا تو مرجعِ دل یہ جہاں نہ تھا
شرمندگی ہوئی مجھے اپنے ضمیر سے

دعوے تو تھا بہت ارنی گوے طور کو
ہوش اُڑ گئے ہیں ایک سُنہری لکیر سے

دُنیا کا خون دَورِ محبّت میں ہے سفید
آواز آ رہی ہے لبِ جوئے شیر سے

مشہور تھے کبھی مرے نغمے چمن چمن
پوچھو تو میرا حال کسی ہم صفیر سے

واعظ! یہ وعظ آپ کا کیا ہو اثر پذیر
واقف ہوں میں جناب کے مافی الضمیر سے

کیا خستگی کی داد نہ پائے گا کوہ کن؟
جب صبحِ حشر ہو گی عیاں جوئے شیر سے
مبتلا ازل سے دردِ محبت کا ہوں عزیز
خلقت ہے غم کی میرے بقیہ خمیر سے

(۲۳)

۲۰ر فروری ۱۹۲۱ء

جام خالی جہاں نظر آیا — میری آنکھوں میں خوں اُتر آیا
وہ بہت کم کسی نے دیکھا ہے — مجھ کو جو کچھ یہاں نظر آیا
جھک گئے آسمان سجدے میں — کون یہ اپنے بام پر آیا
کانپ اُٹھا چرخ، ہل گئی دُنیا — وہ جہاں اپنی بات پر آیا
اُس نے پوچھا مزاج کیسا ہے — دل جو اُمڈا ہوا تھا بھر آیا
جب کبھی اُس نے کی نظر مجھ پر — ایک چھالا نیا اُبھر آیا
تیری جانب سے ہوشیار گیا — اپنی جانب سے بے خبر آیا

جب کیا قصدِ ضبطِ آہ عزیز
دل میں چھالا سا اِک اُبھر آیا

(۲۱)

۱۹ فروری ۱۹۲۱ء

دلِ کشتۂ نظر ہے ، محرومِ گفتگو ہوں
سمجھو مرے اشارے ، میں سُرمہ در گلو ہوں

مدّت سے کھو گیا ہوں ، سرگرمِ جستجو ہوں
اپنا ہی مدّعا ہوں ، اپنی ہی آرزو ہوں

صورت سوال ہوں میں ، پوچھو نہ میرا مطلب
میں اپنے مدعا کی ، تصویر ہو بہو ہوں

ہے دل میں جوشِ حسرت رُکتے نہیں ہیں آنسو
رِستی ہوئی صراحی ، ٹوٹا ہوا سبو ہوں

زخموں سے دل کا عالم کیا پوچھتے ہو کیا ہے
گل زارِ بے خزاں ہوں ، دُنیائے رنگ و بو ہوں

جلوے حجاب افگن ، آنکھیں ہلاکِ حسرت
تم محوِ پردہ داری ، میں وقفِ جستجو ہوں

پامال یوں ہوا ہوں پنہاں ہے مجھ میں عالم
اک مشتِ خاک ہو کر صحرائے آرزو ہوں

رُخ سے کفن ہٹا دو ، کیا پوچھتے ہیں پوچھیں
پردے میں خامشی کے سرگرمِ گفتگو ہوں

کس سے عزیزؔ رکھوں اُمید دوستی کی،
سرکش ہے نفس جب تک اپنا ہی میں عدو ہوں

(۲۵)

۱۸ر فروری سنہ ۱۹۲۱ء

اچھا ہوا کہ رنگِ طبیعت بدل گیا
بہ بہ کے آنسوؤں میں کلیجا نکل گیا

آئے نہ وقتِ نزع، مرا دم نکل گیا
کہنے کو بات رہ گئی، اور وقت ٹل گیا

دل ہی نہ اب وہ دل کی خلش مطمئن ہوں میں
کانٹا کھٹک رہا تھا وہ آخر نکل گیا

یہ سوچتا ہوں رنگِ طبیعت کو دیکھ کر
یہ میں بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

تاثیرِ انقلاب تھی میری نگاہ میں
جس پہ نظر جمائی وہ نقشہ بدل گیا

اُمیدوارِ وصل کو اُن کا جوابِ صاف
اِک تیر تھا جو توڑ کے پہلو نکل گیا

جو عمر بھر گھٹا ہو، بھلا اس کی موت کیا
بس یہ ہوا کہ مُنہ سے دھواں سا نکل گیا

کٹتی نہ آج رات، وہ اُلجھن تھی شام کو
رُونا جو آگیا تو ذرا جی سنبھل گیا

دیکھے تو کوئی نالۂ شبگیر کا اثر
تھا جو نفس وہ درد کے سانچے میں ڈھل گیا

تاثیرِ وحشت آج ہوا میں ہے کیا کروں
تھی جیب پر نگاہ کہ دامن نکل گیا

اب ہم کسی سے ملنے کے قابل نہیں عزیزؔ
مدّت ہوئی کہ رنگِ طبیعت بدل گیا

(۲۶)

آنکھوں سے خونِ دل کا جو قطرہ نکل گیا
مضمونِ زندگی کی وہ سُرخی بدل گیا

دُنیا ہے چند خاک کے پُتلوں کی ایک بزم
جب مل گئے یہ خاک میں نقشہ بدل گیا

دل چاہتا تھا جاؤں تری جلوہ گاہ تک
تولے تھے پر کہ شہپرِ پرواز جل گیا

کیا رو رہا تھا شامِ جوانی کے واسطے
پیری تھی جس کی صبح وہ دن بھی تو ڈھل گیا

مدّت کے بعد مشقِ تصوّر سے یہ ہوا
دھندلا سا ایک نقش ابھر کر نکل گیا

کب تک رہے گی روح عذابِ الیم میں
یہ سادہ لوح ناصحِ بے مہر کھل گیا

ساقی نگاہِ تشنۂ مے کش کا دیکھ اثر
شیشے دھرے رہے تھے کہ ساغر ابل گیا

روشن ہوا عزیزؔ سے پھر لکھنؤ کا نام
مدّت سے جو چراغ بجھا تھا وہ جل گیا

(۲۷)

۲۰ فروری ۱۹۲۱ء

نفسِ امّارہ کو آمادۂ طاعت کرتا
ہوش آتے تو عزیزؔ اپنی عبادت کرتا

مجھ کو دوزخ میں کوئی جھونک بھی دیتا تو کیا
جب ابھرتا کوئی ذرّہ تو محبّت کرتا

عشق کو ہے سروسامانِ طرب کی خواہش
دل بھلا گریۂ خونیں پہ قناعت کرتا

مجھ کو کافر ہی سمجھتے یہ خدا کے بندے
فاش اگر پردۂ اسرارِ حقیقت کرتا

تیرا اندازۂ رحمت جو بیاں کر دیتا
کوئی دُنیا میں نہ پھر تیری عبادت کرتا؟
ہے بیاضِ کفن آئینۂ حالاتِ عزیز
اور کیا شرحِ ملالِ شبِ فرقت کرتا

(۲۸)

۵ مارچ ۱۹۲۱ء

پائے طلب بھی شل ہوئے راہ میں جستِ خیز سے
منزلِ عشق طے ہوئی جبہۂ سجدہ ریز سے
بندِ نقاب کھول دے، ختم بھی ہو یہ مرحلہ
میرا تو دم اُلٹ گیا، شورشِ رستخیز سے
دل میں جراحت آنکھ تر، سر میں دھمک جگر میں درد
رازِ حیات کھل گیا، عشقِ نتیجہ خیز سے
ناز نے تیغ تیز کی، غمزے نے خوں بہا دیا
دل کو نجات مل گئی کشمکشِ ستیز سے
رنگِ ہوا بدل گیا، زلف یہ کس نے کھول دی
قلب و دماغ بس گئے موجۂ مشک بیز سے
ساقیٔ ناز آفریں، تیری صدا کے میں نثار
خون رگوں میں بڑھ گیا، زمزمۂ بریز سے

روکشِ ماہتاب ہے، دامن گوہریں مرا
ٹوٹے ہیں تارے رات بھر دیدۂ اشک ریز سے

طبقۂ دل اُلٹ گیا، دورِ جہاں پلٹ گیا
دیکھ لیا جہاں عزیز، اُس نے نگاہ تیز سے

(۴۹)

۶ مارچ ۱۹۲۱ء

کبھی حالت نہ کہی دل کی زباں سے میں نے
بند کی آنکھ تماشائے جہاں سے میں نے

پردۂ حشر میں دُنیا نظر آئی مجھ کو،
آنکھ کھولی تھی ذرا خوابِ گراں سے میں نے

ہوں وہ بلبل، مری آواز سے کلیاں چٹکیں
دل کو صد پارہ کیا طرزِ بیاں سے میں نے

دل کی ہستی نہ سہی، مجھ کو بہت پیارا ہے
تم کو پایا ہے اِسی ایک نشاں سے میں نے

لے گئی اس کی چمک مجھ کو خدا جانے کہاں
پائی معراج اِسی دردِ نہاں سے میں نے

آسماں کو تھے میسر یہ ستارے کس دن
دل کے چھالوں کو اُبھارا ہے فغاں سے میں نے

آپ جس دل سے گریزاں تھے اُسی دل سے ملے
دیکھئے ڈھونڈھ نکالا ہے کہاں سے میں نے
جادۂ عشق کے حالات خطرناک عزیز
کہہ دیے تھے دلِ گم گشتہ نشاں سے میں نے

(۳۰)

یکم مئی ۱۹۲۱ء

زلف' اور لاش پر سنواری ہو — واہ کیا شانِ سوگواری ہے
میری آنکھوں کا ایک اک پردہ — چادرِ ابرِ نو بہاری ہے
ہوش دُنیا کو آ نہیں سکتا — یہ غشی تو ازل سے طاری ہے
حُسن چھپتا نہیں چھپائے سے — پردہ داری ہی پَردہ داری ہے
حشر والے عرق میں ڈوبے ہیں — گرم بازارِ شرمساری ہے
تم ہو اور امتحانِ محرومی — ہم ہیں اور شغلِ آہ و زاری ہے
عہدِ جمشید ہو گیا آخر — نوبت اس دور میں ہماری ہے
سیرِ گلشن مری نظر میں فقط — اک تماشائے دل فگاری ہے
اَب تو زندہ ہی دفن کر دو مجھے — دوستو! وقتِ پردہ داری ہے

زندگی کس طرح کٹے گی عزیز
بے قراری سی بے قراری ہے

(۳۱)

۲۲ جولائی ۱۹۲۱ء

دیدۂ خشک میں دیکھی تپشِ دل میں نے
سونپ دی بحر کو خودداریِ ساحل میں نے

دفترِ کُن میں جو تھا نقطۂ اسرارِ وجود
آہ برباد کیا آج وہی دل میں نے

مجھ کو بہتے ہوئے دریا سے نہ پہنچا کچھ فیض
جان دی تشنہ لبی میں لبِ ساحل میں نے

وقت آرائشِ گیسو کا بہت نازک ہے
کہہ دیا تھا دلِ آشفتہ شمائل میں نے

میری دشوار پسندی نے کیا مجھ کو ہلاک
کسی مشکل کو نہ سمجھا کبھی مشکل میں نے

ذرے ذرے میں نہاں نشترِ عبرت تھا
عمر بھر کچھ نہ کیا دہر سے حاصل میں نے

آخری نزع کی ہچکی بھی اب آنے ہی کو ہے
حل کیا، شکر خدا، عقدۂ مشکل میں نے

مستِ صہبائے جوانی، کوئی آواز تو دے
کھٹکھٹایا ہے کئی بار درِ دل میں نے

ضعف میں بھی تھی مجھے خشکیٔ مژگاں پہ نظر
کھول دی جوشِ حمیت میں رگِ دل میں نے
مجھ کو دنیا سے تعلق ہی نہیں کوئی عزیز
کر دیا دور یہ اندیشۂ باطل میں نے

(۲۳)

۲۸ راگست ۱۹۲۱ء

شاید عزیز آہ میں تاثیر ہو گئی
دنیا تمام درد کی تصویر ہو گئی

لوحِ حیات آپ کی تقریر ہو گئی
جو بات کی نوشتۂ تقدیر ہو گئی

جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دیں مرے یہاں
بس ختم سعی کاتبِ تقدیر ہو گئی

دل کو جلا کے دولتِ جاوید پا گیا
اتنی سی خاک مایۂ اکسیر ہو گئی

اے سعیٔ نامراد! بتا کیا جواب دوں
تقدیر پوچھتی ہے کہ تدبیر ہو گئی؟

کہیے کہ اب میں اپنی حقیقت کو کیا کہوں
جو سانس لی وہ آپ کی تصویر ہو گئی

ہاتھوں سے میرے دامن رحمت چھڑا تو لے
ہاں ہاں! یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

تھا نزع میں بھی سلسلۂ قید غم وہی
اینٹھی جو رگ وہ حلقۂ زنجیر ہو گئی

آزاد ہوں قیودِ جہنم سے دوستو!
میری حیات ہی مجھے تعزیر ہو گئی

دل کو ہے اعتراف، زباں معترف نہ ہو
ایمان کی تو یہ ہے کہ تقصیر ہو گئی

اب دل پہ یادگارِ سعیدہ[۱] کا داغ ہے
پیوندِ خاک چاند سی تصویر ہو گئی

ہستی کی شرح، نزع میں کرتا مگر عزیزؔ
دو ہچکیوں میں ختم یہ تفسیر ہو گئی

(۴۳)

۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء

جب سے ترا خیال ہم آغوش ہو گیا
میں خود ہی اپنے دل سے فراموش ہو گیا

۱؎ دختر ہفت سالۂ مصنف

تھی عشق میں حقیقتِ ہستی بس اس قدر
اک آہ بھر کے آتشِ خاموش ہو گیا

جب سے خیالِ وعدہ وفائی ہوا اُسے
اُس دن سے اور زود فراموش ہو گیا

اک بے کسی سی چہرۂ صبحِ وطن پہ تھی
یہ رنگ دیکھ کر میں کفن پوش ہو گیا

زحمتِ کثیفِ جسم بہت بار تھا مجھے
احساں اجل کا، آج سُبک دوش ہو گیا

اب تم ہو اور تجلّیِ برقِ نگاہ ہے
ہشیار! اہلِ بزم، میں بے ہوش ہو گیا

طغیانِ ناز نے مجھے طوفاں بنا دیا
ہر قطرہ خون کا ہمہ تن جوش ہو گیا

صرف امتحانِ دیدۂ بینا کے واسطے
وہ پردۂ مجاز میں روپوش ہو گیا

کچھ اور بڑھ گئے مرے عصیاں کے حوصلے
تو جتنا جرم بخش و خطا پوش ہو گیا

خاتونِ مصر! اب مہِ کنعاں کے واسطے
زنداں تمام حلقۂ آغوش ہو گیا

تھا اس سے قبل بزم میں ہنگامہ گرم کن
سمجھا میں رازِ دہر تو خاموش ہو گیا

بجلی چمک رہی تھی بہ تمہیدِ امتحاں
پردہ سرک رہا تھا کہ بے ہوش ہو گیا

کیا دیکھتا ہوں کون یہ بیٹھا ہے میرے پاس
میں اپنے ہوش میں ہوں کہ بے ہوش ہو گیا

کہتا بہت کچھ اہلِ سخن سے، مگر عزیز
محفل کا رنگ دیکھ کے خاموش ہو گیا

(۴۴)

جنوری سنہ ۱۹۲۱ء

میری ہستی کا بتاؤ تم نتیجہ کیا ہوا
بعد مرنے کے بساطِ خاک کا دھبا ہوا

نزع میں ہوں، ڈوبنے کو ہے ستارہ صبح کا
ایک آنسو دیر سے ہے آنکھ میں ٹھہرا ہوا

یہ ہوا کیسی چلی، تنکوں نے خود گھیرا مجھے
آشیانے سے مرے میرا قفس پیدا ہوا

قبر سے مردہ داد خواہی کو اٹھے خونیں کفن
آفتابِ حشر نکلا خون میں ڈوبا ہوا

متصل جلووں نے تیرے کیں بساط آرائیاں
بجلیوں کی باڑھ پر اس راہ میں چلنا ہوا

ابر میں اور بجلیوں کی لہر میں اُٹھا کوئی
بال بکھراتا ہوا ، انگڑائیاں لیتا ہوا

دیکھتے ہی دیکھتے دھندلے ہوئے نقش و نگار
اے مری جاتی ہوئی دُنیا، یہ تجھ کو کیا ہوا

منزلِ اُلفت میں اپنی محویت کے میں نثار
مجھ کو ہر رہ رَو پہ تیری شکل کا دھوکا ہوا

کس نے گھبرا کر اُلٹ دی اپنے چہرے سے نقاب
دیکھتا ہوں میں زمانے کا ورق اُلٹا ہوا

اس کو قشقہ جان کر مسرور تھے صورت پرست
نقش جب پیشانیٔ دُنیا پہ حرفِ "لا" ہوا

یہ حجابِ زندگی اُٹھے تو دیکھو کیا ہوں میں
اصل اگر پوچھو تو میں خود اپنا ہی پردا ہوا

عمر بھر کی جاں فشانی کا خلاصہ ہے یہی
جو پسینا نزع میں ماتھے پہ ہے آیا ہوا

عالمِ گورِ غریباں کیا معمّا ہے خدا!
کس سے پوچھوں حال، سارا شہر ہے سویا ہوا

یہ غزل پڑھتا ہوا مستانہ لہجے میں، عزیزؔ
کوچۂ قاتل سے نکلا خون میں ڈوبا ہوا

(۴۵)

۱۰ اپریل ۱۹۲۲ء

نہ پوچھو مجھ سے کب تھا اور کہاں تھا آشیاں میرا
تجلّی سربسجدہ تھی مکاں تھا لا مکاں میرا

نظر محدود، دُنیا تنگ، باز آیا میں جینے سے
یہی ہے گر زمیں میری، یہی گر آسماں میرا

بلندی عرش کی دبتی ہے دل کی شانِ رفعت سے
مگر تم نے ملایا خاک میں یہ آسماں میرا

یہ کس نے پاؤں رکھا سرِ حدِ گورِ غریباں میں
زمیں سے پھر اُبھر آیا مزارِ بے نشاں میرا

رہا ہو کر قفس سے اب لیے جاتا ہے کس جانب
تجھے کچھ ہوش ہے اے دل! نشیمن تھا کہاں میرا

مثالِ نقشِ پا درماندگی، آثارِ غفلت ہیں
مدد اے جذبۂ دل بڑھ چلا ہے کارواں میرا

بجز رُوحُ القدس دے کون داد اس نغمہ سنجی کی
نہ کوئی ہم سخن میرا، نہ کوئی ہم زباں میرا

قفس سے خاک اُڑی میری، نشیمن سے اُڑے تنکے
ہوا میں ڈھونڈھتا پھرتا ہے مجھ کو آشیاں میرا
عزیزو آخر کہاں تک، نزع کی بھی ایک مدّت ہے
زباں ہوتی ہے بند، اب ختم ہوتا ہے بیاں میرا

(۳۶)

۲۱ ، اپریل ۱۹۲۳ء

عشق سے بس ایک سوزِ دل مجھے حاصل ہوا
وہ بھی صرفِ گرمیِ ہنگامۂ محفل ہوا
کس کا پرتو حُسن کی تفسیر میں شامل ہوا
سینۂ گیتی میں جو ذرّہ تھا وہ اک دل ہوا
داستانِ زندگی کہنے کی فرصت ہی کسے
مختصر یہ ہے اب ان کے رحم کے قابل ہوا
میرا دل، سورج، نسیمِ صبح، سیّاروں کی بزم
کون کون اس کی نگاہِ ناز سے بسمل ہوا
بزمِ غم سجتا ہے اب ہر ذرّہ میری خاک کا
تھا اکیلا بعد مرنے کے مگر محفل ہوا
اُس نے گھبرا کر اُلٹ دی اپنے چہرے سے نقاب
الفراق اے رُوح! اب جینا بہت مشکل ہوا

رُوح کی خلقت کا پیکر میں وہی ہنگام تھا
دل ازل میں جب نگاہِ ناز سے بسمل ہوا

حُسن تھا رُوزِ ازل جب وقت سرگرمِ نمود
رُخ سے ٹپکا ایک قطرہ اور ظہورِ دل ہوا

عکس تیرے خالِ رُخ کا ظاہر و باطن فروز
بن گیا دل میں سویدا، پتلیوں میں تل ہوا

ہجر میں اخفائے رازِ عشق تھا کارِ محال
آنکھ سے جو اشک ٹپکا ترجمانِ دل ہوا

عشق نے قالب بنایا، رُوح پھونکی درد نے
جوشِ بے تابی تسلی سے رُکا اور دل ہوا

اِس محیطِ عشق میں جس کا کنارہ ہی نہ تھا
ڈوب کر اُبھرا تو اوروں کے لیے ساحل ہوا

اپنی تصویروں سے خود آراستہ اک بزم کی
دل میں کیا آئی کہ پھر برہم زنِ محفل ہوا

اِک نگاہِ واپسیں اُس سے بہت کچھ کہہ گئی
پھر بھی اس حُسنِ بلاغت کا نہ وہ قائل ہوا

سُوزِ باطن، نورِ عرفاں اُس مسافر کا نہ پوچھ
ہر نفس جس کا چراغِ جادۂ منزل ہوا

بعد میرے آنے والے مطمئن شاید رہیں
مجھ کو تو اک سانس لینا بھی یہاں مشکل ہوا

تو بھی رہنا شاہد اے پچھلے پہر کی خامشی
کشتۂ ضبطِ محبت جس طرح غافل ہوا

میرے دل کی آیتوں سے ہے بہت کچھ اختلاف
یوں تو سب پر یہ صحیفہ عشق کا نازل ہوا

گلشنِ ہستی ہے میرے واسطے زنداں عزیزؔ
سرو کی مانند آزادی میں پا در گل ہوا

(۳۷)

۱۲؍ اپریل ۱۹۲۶ء

جو گیا تقدیر کا شاکی گیا
چار و ناچار آپ سے راضی گیا

کون اب تصویر کھینچے گا تری
وہ دلِ صورت گر معنی گیا

رو رہے ہیں کس لیے یہ نوحہ گر
مرنے والا مر گیا یا جی گیا

میں تھا پیاسا اور ساقی تھا جواد
اب خدا معلوم کتنی پی گیا

خاک کے ذرّوں میں طوفاں ہیں عزیزؔ
مر کے کوئی جذبۂ فطری گیا!

---

(۳۸)

۲۰ر جولائی ۱۹۲۲ء

دُنیا کو ولولہ دلِ ناشاد سے ہوا
یہ طول اِس خلاصۂ ایجاد سے ہوا
فصلِ جنوں میں سینۂ و ناخن کو مِل کر دیکھ
کیا بے ستوں پہ تیشۂ فرہاد سے ہوا
رحمت نے بڑھ کے سرد جہنّم کو کر دیا
کیا قصور یہ دلِ ناشاد سے ہوا
خوش ہوں میں وقتِ نزع خوشا لذّتِ فراغ
جو کچھ ہوا وہ آپ کے ارشاد سے ہوا
یہ ہے حقیقتِ عدم و عالمِ وجود
وہ خامشی سے یہ مری فریاد سے ہوا
ناواقفِ رسوم، محبت ہے کوئی چیز
انساں عزیزؔ شیوۂ فریاد سے ہوا

(۳۹)

۲ر اگست ۱۹۲۲ء

پاسِ آدابِ وفا نے مجھ کو مجرم کر دیا
سانس لینا بھی تری محفل میں اب کم کر دیا

پہلے تو خلوت کدے کا مجھ کو محرم کر دیا
رفتہ رفتہ رازدارِ ہر دو عالم کر دیا

دل کو پُرغم کر دیا، آنکھوں کو پُرنم کر دیا
عشق نے سامانِ دلچسپی فراہم کر دیا

جوشِ عشرت کو شریکِ لذّتِ غم کر دیا
میں نے صبحِ عید کو بھی شامِ ماتم کر دیا

اللہ اللہ! خاک کے پُتلے ترا یہ اقتدار
ایک دل نے تجھ کو مختارِ دو عالم کر دیا

موج زن اِس سے ہوا دریائے ناپیدا کنار
جس زمیں کو میرے اشکوں نے کبھی نم کر دیا

منزلِ ہستی کو سمجھے تھے بہت دُور دراز
روک کر سانسوں کو ہم نے فاصلہ کم کر دیا

لب تک اُس کا نام آجاتا ہے اب بے اختیار
بات کرنا بھی اِسی ڈر سے بہت کم کر دیا

قدرتِ اشکِ ندامت کی ہے کوئی انتہا
سرد اِک آنسو نے بازارِ جہنّم کر دیا

اے خدا میرے نہ ہونے سے کوئی نقصان تھا
مجھ کو پیدا کر کے کیوں رسوائے عالم کر دیا

خاطرِ واعظ سے جب ڈالی حقیقت پر نظر
بادۂ صافی کو میں نے آبِ زمزم کر دیا

پھر نگاہِ ناز سے بے کار اُمیدِ التفات
دل کے زخموں کو اگر ممنونِ مرہم کر دیا

غم کشوں کی فردِ ازل میں جب رقم ہونے لگی
مجھ کو اُس فہرست میں سب سے مقدّم کر دیا

دَورِ گردوں سے کہو، ساقی کی چشمِ مست نے
اب مجھے رونق فزائے مسندِ جم کر دیا

ذرّہ ذرہ خاک کا میری کہے گا داستاں
آپ سمجھے ختم میں نے قصّۂ غم کر دیا

عقدۂ لاحل تھی مجھ سے سخت جاں کی جانکنی
تم نے اگر اور بھی یہ راز مبہم کر دیا

دل کے ہر ذرّے کو میں نے تمنائے خاک میں
مایۂ افزائشِ اسبابِ عالم کر دیا

عشق کی صورت گری پر جھک گئیں پیشانیاں
خاک کے پُتلے کو جس وقت اُس نے آدم کر دیا

آپ کہتے تھے بنائیں گے خدائی ہم الگ
لیجیے، دل نے وہ ساماں بھی فراہم کر دیا

ہاں کہو، ابرِ سیہ مست اُٹھ کے آئے سامنے
چشمِ تر نے گوشۂ دامن کو اب نم کر دیا

غم کی یہ مقدار خلقت کے لئے خدا کافی نہیں
میں نے اب ہر موئے تن کو تشنۂ غم کر دیا

جب حریمِ ناز سے آئی صدائے دور باش
اضطرابِ دل نے بڑھ کر تجھ کو محرم کر دیا

دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہوتا رُوح کو
اس گرہ نے اور بھی رشتے کو محکم کر دیا

دل کے اجزا میں نہیں ملتا کوئی جزوِ نشاط
اس صحیفے سے کسی نے اک ورق کم کر دیا

خاکدانِ دہر کی بنیاد ہی کیا تھی عزیزؔ
میری ہستی نے فقط عالم کو عالم کر دیا

(۴۰)

۱۳ر اگست ۱۹۲۲ء

کر دیا انکار ازل میں جس سے ہر دل گیر نے
وہ مری قسمت میں لکھا کاتبِ تقدیر نے

دیکھتی ہی رہ گئی تاثیرِ جذبِ مرکزی
کر دیا پیوندِ خاک اس خاکِ دامن گیر نے

موت سے پہلے لکھا تھا میں نے اُن کو ایک خط
کر دیا ہنگامہ اُٹھا حسرت بھری تحریر نے

کوہ کن سے ہجر کی راتیں نہ جب کاٹی گئیں
صبح کر دی عشق کی دُنیا میں جوئے شیر نے

صفحۂ دُنیا کے اس جانب نہ آیا کچھ نظر
کس قدر دھوکا دیا اس نیم رُخ تصویر نے

عالم فانی و باقی کو دکھایا ہے فقط
اِک مری تصویر نے اِک آپ کی تصویر نے

آپ کچھ سمجھے مری ہستی کو، میں سمجھا کچھ اور
خواب کو اُلجھا دیا اس کثرتِ تعبیر نے

دونوں ہاتھ اُس نے ملا کر اس طرح انگڑائی لی
مار ڈالا کھنچ کے دوہری باڑھ کی شمشیر نے

قوّتِ ابداع ہے ہر شعر میں میرے عزیزؔ
فیض پہنچایا مجھے شیراز اور کشمیر نے

(۴۱)

۱۵، نومبر ۱۹۲۲ء

رخصت اے صبر! آس ٹوٹ گئی — کھل گیا راز بات پھوٹ گئی
ہچکیاں نزع کی بتاتی ہیں — ہر کڑی سلسلے کی ٹوٹ گئی

بلا سنگِ آستاں تیرا — ہائے تقدیر میری پھوٹ گئی
اب تحیّر ہے رات دن مجھ کو — عادتِ آہ و نالہ چھوٹ گئی
لاکھ پردوں میں تم چھپے پھر بھی — حُسنِ پنہاں کی بات پھوٹ گئی

نخلِ اُمید کیا پھلے گا عزیزؔ
ایک اک شاخ اس کی ٹوٹ گئی

(۴۴)

۲ر دسمبر ۲۲ء

راز ہی ایسا ہے کوئی راز داں ملتا نہیں
ہوں، تن تنہا شریکِ امتحاں ملتا نہیں

اِس طرف سجدوں کا اک محشر جبینوں میں بپا
اُس طرف یہ قہر، سنگِ آستاں ملتا نہیں

منزلِ ہستی میں اک یوسف کی تھی مجھ کو تلاش
اب جو دیکھا، کارواں کا کارواں ملتا نہیں

زورِ وحدت تھا کہ کثرت جذب ہو کر رہ گئی
تو ہی تو ہے، بزمِ ہستی کا نشاں ملتا نہیں

ذرّے ذرّے پر لگی ہے مہر، کیا سمجھے کوئی
راز تو لاکھوں ہیں، لیکن راز داں ملتا نہیں

ہم صفیرانِ قفس، میری جگہ خالی رہے
ہوں میں گم کردہ نشیمن، آشیاں ملتا نہیں
یادگارِ منزل رہ گئے ہیں چند داغ
کاروانِ عمرِ رفتہ کا نشاں ملتا نہیں
میں وہ دریا ہوں جسے طوفان نے تعلیم دی
جز تلاطم حاصلِ عمرِ رواں ملتا نہیں
برق بن کر اڑ گئے تنکے نشیمن کے عزیز
بجلیاں ٹوٹیں نہ جب تک آشیاں ملتا نہیں

(۴۴)

۳۰ر دسمبر ۱۹۲۲ء

سبق ملے ہیں اِس آئینِ دل نوازی سے
نیاز مند بنایا ہے بے نیازی سے
بنا دیا نہ زمانے کو داستاں جب تک
ملی نہ عشق کو فرصت زمانہ سازی سے
یہی ثبوتِ عدم ہے، یہی دلیلِ فنا
کہ آفرینشِ عالم ہے بے نیازی سے
نہیں شکایتِ بیداد، ہاں گلہ یہ ہے
یہ انتخاب ہوا ہے خوش امتیازی سے

ضرور ہے دلِ محمود رحم کے قابل
مگر ایاز کو فرصت کہاں ایازی سے

یہ وقت کون سا آیا ہے لے خدا مجھ پر
کہ چارہ ساز لرزتے ہیں چارہ سازی سے

یہ راز کھل بھی گیا کب کا جاں نثاروں پر
نہ باز آئے مگر تم زمانہ سازی سے

ہیں غرقِ آتشِ تر، تیرے رندِ تر دامن
پگھل گیا ہے جہنم بھی دل گدازی سے

ہم ایک رازِ حقیقت ہیں، بے نیازِ جہاں
علاقہ کیا ہمیں اس پیکرِ مجازی سے

میں مطمئن تھا، مگر میرے ناخدا تو نے
ڈبو دیا مجھے طوفانِ بے نیازی سے

انھیں ملی نہ کبھی اِلتفات کی فرصت
وفا کا خون ہوا شانِ بے نیازی سے

نوائے عالمِ وحدت کا راز دار ہے دل
بھرا ہے سازِ مرا نغمۂ حجازی سے

لیا ہے گورِ غریباں نے درسِ عبرت کا
سکوتِ موت کی پیہم سخن طرازی سے

عبا میں بُت ہیں، بغل میں صراحیِ مےِ ناب
حذر ہے حضرتِ واعظ کی پاک بازی سے

زباں کھُے گی بھلا کیا، کھُلے ہیں جو عقدے
کسی کی چشمِ سیہ کی سخن طرازی سے

جوابِ حسرتِ دیدار، خطِ شوق میں تھا
یہ برقِ طورِ عبارت تھی دل نوازی سے

ہزار طرح کے دل میں خیال آئے ہیں
تمام رات ستاروں کی دیدہ بازی سے

بیانِ حال کو ماتھے پہ کچھ عرق نکلا،
زبان رُک گئی جب شرحِ جاں گدازی سے

یہ اہتمام ہیں اخفائے حُسن کے پھر بھی
دِکھا رہا ہے جھلک پردۂ مجازی سے

دلِ عزیزؔ کی بستی نہیں ہوئی برباد
مگر نگاہِ رمیدہ کی ترک تازی سے

(۴۴)

یکم جنوری ۱۹۲۳ء

ہے تیرے سائے میں نازاں رُخِ چمن پرور
دراز عمر تری کاکلِ شکن پرور

بنے گی حضرتِ ناصح سے کس طرح مجھ سے
میں اپنے عشق پہ مغرور، وہ سخن پرور
فنا کے بعد بھی ہے احتیاج خلعت تو
ضرورت کفن اب بھی ہے تجھ کو تن پرور
بنے گی آپ سے کیا حضرتِ عزیزؔ اُن سے
اگر ہیں آپ سخن داں تو وہ سخن پرور

(۴۵)

۹ فروری ۱۹۲۳ء

تجھے ہر چند ذوقِ جستجو ہے — خودی تیری حجاب آرزو ہے
چمک اے جلوۂ نادیدہ دم بھر — ہر اک ذرے کو تیری جستجو ہے
نشیمن میں رہیں آزاد کیونکر — چمن تو خود اسیر رنگ و بو ہے
بساطِ دہر سے دھوکا نہ کھانا — کہ یہ دامِ فریبِ آرزو ہے
حرارت عشق کی کرنا نہ تھی ضبط — پسینا یہ نہیں، دل کا لہو ہے
عزیزؔ افسردہ ہوں طرزِ سخن سے
بہت عامی مذاقِ لکھنؤ ہے

(۴۶)

۲۰ فروری ۱۹۲۳ء

دل کا چشمہ اُبلتا ہی رہا — خون آنکھوں سے نکلتا ہی رہا

آستانِ حسن پر بیٹھا ہوا خاک میں چہرہ پہ ملتا ہی رہا
کم نہ تھا ہنگامۂ جوشِ بہار دل مگر پھر بھی مچلتا ہی رہا
حسنِ رخ جو تھا حجاب اندر حجاب ذرّے ذرّے سے اُبلتا ہی رہا
ہیں تغیّر اس کرے میں کس قدر رُوز اک نقشہ بدلتا ہی رہا
نزع کا عالم تھا افسوں کا شمار زندگی بھر دم نکلتا ہی رہا

اپنے مرکز پر رہا قائم عزیزؔ
دَورِ عالم کا بدلتا ہی رہا

(۴۷)

۳ر جون ۱۹۲۳ء

کیا کہوں اسرار خاموشی کسی دم ساز سے
لوگ اسے پہچان لیتے ہیں مری آواز سے

کر چکیں جب قتل آنکھیں، لب نے زندہ کر دیا
رد ہوا آخر کو جادو قوّتِ اعجاز سے

دل شکستہ ہو کے جا بیٹھا قریب آستاں
جب صدائے دور باش آئی حریم ناز سے

نفسِ آگاہ ریاکاری ہوا، وا حسرتا!
سابقہ جب سے پڑا احبابِ دُنیا ساز سے

عمرِ رفتہ کو ذرا آواز دے اے زندگی
سننے بیٹھے ہیں وہ میری داستاں آغاز سے

چشمِ بینا چاہیے نامحرموں کے واسطے
چھن رہی ہے اک تجلّی پردہ ہائے راز سے

عرش ہے اک فرش پا انداز، اللہ رے عروج
پوچھیے لُطفِ کشش حُسنِ سبک پرواز سے

بے نیازی کی بھی حد ہے کوئی اے جانِ عزیز
یہ ادائے بے رخی اک بندۂ جاں باز سے

(۴۸)

۲۷، اکتوبر ۱۹۲۳ء

وہ بے نقاب جو ہنگامِ خواب ہوتا ہے
سمٹ کے جلوۂ رُخ ماہتاب ہوتا ہے

اُلٹ رہے ہیں دمِ نزع آنکھ کے پردے
قریبِ وصل ہے، کشفِ حجاب ہوتا ہے

ازل کے بعد قیامت ہے حُسن کی منزل
کہ جس میں تیغ بکف پھر شباب ہوتا ہے

یہ بجلیوں کا تصادم یہ حسن و عشق کا میل
نظر، نظر سے لڑانا عذاب ہوتا ہے

حریمِ ناز میں جس وقت سانس لیتا ہوں
خیالِ حسن نزاکت مآب ہوتا ہے

سنبھل کے حشر میں آئیں ذرا لحد والے
یہ وقت وہ ہے کوئی بے حجاب ہوتا ہے

تعلقاتِ دوئی ناگوار ہیں اتنے
خود اپنی ذات سے اب اجتناب ہوتا ہے

دمِ تلاشِ رگِ جاں سے آتی ہے آواز
کمالِ قرب ہمیشہ حجاب ہوتا ہے

پلا دو آبِ دمِ تیغ زندہ ہو جاؤں
کسی کی پیاس بجھانا ثواب ہوتا ہے

صحیفہ عشق کا کرتا ہے جب کوئی تصنیف
وہ میرے نام سے اب انتساب ہوتا ہے

دیارِ حسن میں اڑتا ہے جب غبار کبھی
جبینِ پیرہن آفتاب ہوتا ہے

نظامِ دہر کے ہر دورِ و ہر تسلسل میں
محیطِ سلسلۂ پیچ و تاب ہوتا ہے

اب التفات اسے کہیے خواہ بے زاری
خطا کسی کی ہو مجھ پہ عتاب ہوتا ہے

چھڑک دو بادہ کشو جام سے برسمِ زکوٰۃ
یونہی فروغ شبِ ماہتاب ہوتا ہے

قرار اشارۂ ابرو کو شوخیوں سے کہاں
ہلال یک شبہ پا در رکاب ہوتا ہے

قرار آئے جو مجھ کو تو کس طرح آئے
سکونِ دل سے اُنھیں اضطراب ہوتا ہے

بساطِ ناز پہ سوتا ہے اس طرح کوئی
شباب محو تماشائے خواب ہوتا ہے

عزیز شرحِ طلب بے خودی کی باتیں ہیں
ہر اک کلام مرا اک کتاب ہوتا ہے

(۴۹)

۲۰ر جون ۱۹۲۳ء

یہ چراغِ ہستیِ مضمحل، جو ازل سے جلوہ فروش ہو
اسے ایک آن ہی میں دیکھنا کہ فسانہ بن کے خموش ہو

مجھے رات دن ہے تحیّر اب، یہ حجاب جب سے کہ اُٹھ گئے
نہ وہ ولولہ نہ وہ جوش ہے، نہ وہ عقل ہے نہ وہ ہوش ہو

وہی ترجمانِ ملال تھا، جسے آسماں نے بجھا دیا
کہے کون سوزِ نہاں مرا کہ چراغِ قبر خموش ہے

ترے جاتے ہی وہ چمن نہیں، وہ بہار سرو سمن نہیں
نہ نسیم بادہ گسار ہے، نہ شمیم عطر فروش ہے

(۵۰)

۲۴، نومبر ۱۹۲۳ء

کچھ صلہ دے، رحم کر اس محنتِ برباد پر
بڑھ کے بوسہ دیدے شیریں تیشۂ فرہاد پر

یاد ہے پہلے پہل بجلی گرانا یاد ہے
آپ کی جب مہربانی تھی دلِ ناشاد پر

عشق میں ہر ہر قدم پر موت تھی خضر طریق
منزلیں موقوف تھیں اور اُفتاد پر

خود فراموشی کی لذّت سے ابھی واقف نہیں
حضرتِ زاہد جو بھولے ہیں خدا کی یاد پر

جس لب و لہجہ سے کہنا چاہیے دردِ فراق
ختم ہے وہ عندلیبِ آشیاں برباد پر

یہ قرارِ بزمِ گیتی یہ سکونِ کائنات
منحصر ہے صرف ضبطِ طاقتِ فریاد پر

میں تو ہستی کو سمجھتا ہوں سراسر اک گناہ
پاک دامانی کا دعویٰ ہو تو کس بنیاد پر

باعثِ صد جوش ہوتی ہے شکایت بھی عزیز
مسکرا دیتے ہیں جب وہ شکوۂ بیداد پر

(۵۱)

۲۵ر نومبر ۱۹۲۲ء

مرے بعد انتہائے عشق کی تاثیر دیکھیں گے
تمہارے دیکھنے والے مری تصویر دیکھیں گے
کلیم اندازۂ بے ربطیِ تقریر دیکھیں گے
جوابِ صاف لوحِ طور پر تحریر دیکھیں گے
طلسمِ غم کی بنیادیں پڑیں گی نالۂ دل سے
فضا کے ذرّے ذرّے میں نئی تعمیر دیکھیں گے
چمن کی سیر سے مقصود تھی دل بستگی اپنی
خبر کیا تھی کہ ہر غنچے کو ہم دل گیر دیکھیں گے
ذرا جلنے تو دو دل کو یہ قرآنِ محبت ہے
اسی کی خاک میں کونین کی تفسیر دیکھیں گے
یہ مانا کاتبِ اعمال لکھ لیں گے مرے قصّے
مگر کچھ حالِ دل ناقابلِ تحریر دیکھیں گے
نظر آئیں گے ہم کو قید میں سامانِ آزادی
رگوں سے تن کو جب وابستۂ زنجیر دیکھیں گے

زمیں شق ہو، فلک ٹوٹے، پہاڑ آپس میں ٹکرائیں
مگر ہم آج زورِ نالۂ شب گیر دیکھیں گے

نثارؔ اس دل نوازی کے لگائی ہے گرہ ایسی
کہ ناممکن کشادِ عقدۂ تقدیر دیکھیں گے

چڑھائے ہے تجلی تیوریاں، جاتے تو ہیں موسے
جبینِ طور پر اپنا خطِ تقدیر دیکھیں گے

انھیں پھر قدر ہوگی اپنے حسنِ روز افزوں کی
اگر وہ سلسلے سے میری ہر تصویر دیکھیں گے

دم اُکھڑے پار ہوں، روکے رہیں تا چند دریا کو
عزیزؔ اب کھینچ کر اک نالۂ شب گیر دیکھیں گے

(۵۲)

۱۴ ستمبر ۱۹۲۳ء

پہلے کچھ قدر نہ کی عشق کے بیماروں کی
سرنگوں بیٹھے ہیں اب صف میں عزاداروں کی

بے خبر عشق کے آثارِ قدیمہ نہ مٹا
جوش کھاتا ہے لہو نیو میں دیواروں کی

کہا ہیں یہ ہستی کونین کے دونوں صفحے
ایک فہرست فقط اُن کے طلبگاروں کی

دفن ہے کیا دلِ بیتاب کا ذرّہ کوئی
جنبشیں ہم کو بتاتی ہیں یہ کہساروں کی

ذرّے ذرّے کو بنا دے گی کسی دن مشرق
مہر افروز تجلّی ترے رخساروں کی

ڈبڈبا آئیں کسی مستِ طرب کی آنکھیں
حالت آخر کو نہ دیکھی گئی بیماروں کی

آ، کہ سامانِ تجلّی کی کمی پوری ہو
بزم آراستہ ہے چھٹکے ہوئے تاروں کی

اپنے انداز کو رحمت نے سنور کر دیکھا
آئینہ بن گئیں شکلیں جو گنہ گاروں کی

عہدِ گل، سبزۂ نوخیز، نہالانِ چمن
داستانیں ہیں فقط تازہ گرفتاروں کی

عشق سرگشتہ رہا کشتۂ صد موجِ خرام
کٹ گئی عمر یونہی چھاؤں میں تلواروں کی

یوں، نہ دیکھو کہ انھیں پھر نہ کوئی دیکھ سکے
دیکھ تو لے کبھی صورت کوئی بیماروں کی

ہیں تو میں، کاہشِ غم ہے وہ بری چیز عزیز
شکل دیکھی نہیں جاتی مرے غم خواروں کی

(۵۴)

جنوری ۱۹۲۴ء

پہلے اپنے دل کی طاقت آزمانا چاہیے
پھر حریمِ ناز کا پردہ اُٹھانا چاہیے

یوں دلِ برباد کی بستی بسانا چاہیے
ایک اک ذرے میں بجلی کا خزانا چاہیے

ایک اک شعلے میں ہو تصویرِ حُسنِ دوست کی
آتشِ عشق! اس طرح دل کو جلانا چاہیے

دل کا سرمایہ تھا جتنا نذرِ طوفاں ہوگیا
رُک گئے اشک، اب کلیجا منہ کو آنا چاہیے

سعیِ بے جا کرنے والے تا کجا یہ کوششیں
مٹ سکوں جتنا، مجھے اُتنا مٹانا چاہیے

ہر ادا طاقت رُبا ہے، ہر ادا ہمّت شکن
آزمانے کی حدوں میں آزمانا چاہیے

داستانِ دل میں دونوں کی حقیقت ہے نہاں
اُن کو سُننا چاہیے، مجھ کو سُنانا چاہیے

چین سے برباد ہو کر بھی نہ اے مردِ خدا
ذرّے ذرّے میں نئی بستی بسانا چاہیے

جذب ہو جائیں عناصر ایک عناصر میں فقط
خاک ہو جاؤں یہاں تک خاک اُڑانا چاہیے

اور کچھ عالم ہوں پیدا یہ جہاں محدود ہے
حُسن خود آرا تجھے پھر مسکرانا چاہیے

عہد صیاد اور نشیمن، چار تنکے ہی سہی
اور کیا روح القدس کا آشیانا چاہیے

جذب کر لے روح کو درکار ہے وہ سنگِ در
سر نہ اُٹھے جس سے، اب وہ آستانا چاہیے

سوزِ باطن رائگاں ہو، یہ تو ممکن ہی نہیں
میں کروں ضبط، اور پسینہ اُن کو آنا چاہیے

طاقتیں عالم کی ہیں سرگرم میرے واسطے
اُن کو مٹنا چاہیے خود، یا مٹانا چاہیے

پوچھتا پھرتا ہوں سینے میں لیے ویران دل
کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بسانا چاہیے

سازِ دل کو عشق کی مضراب ہی کافی نہیں
آپ کی آواز اس پردے سے آنا چاہیے

دامنِ تجرید پہ ہم کو اُبھرنا ہے عزیزؔ
صفحۂ ہستی سے نقش اپنا مٹانا چاہیے

(۵۴)

۱۵ مئی ۱۹۳۲ء

خودکشی عشق میں کوئی بات بھی ہے
ہمت اے دل، تجھے ثبات بھی ہے

یوں نہ ظالم ستا کہ اس دل میں
تو بھی ہے تیری کائنات بھی ہے

واعظوں کو خبر نہیں شاید
زاہدِ صد شیوہ مستِ ذات بھی ہے

نیند آجائے اے فلک دم بھر
تیری گردش میں ایسی رات بھی ہے؟

موت ہے گر حیات کو لازم
موت کے واسطے حیات بھی ہے

یہ دلِ سادہ و ستم برباد
لوحِ اسرارِ کائنات بھی ہے

مستحق اک نگاہ کا تیری
دلِ محرومِ التفات بھی ہے

غور سے دیکھ مقبروں کی طرف
ان میں دُنیا کی واردات بھی ہے

کوئی ذرہ نہیں یہاں کا ثبات
حامل بارِ حادثات بھی ہے
اُس کے ملنے میں دونوں عالم ہیں
زندگی بھی ہے اور ممات بھی ہے
جادۂ عشق ہے عزیز عزیزؔ
مر مٹو گر، تو ایک بات بھی ہے

(۵۵)

۱۰ / مئی ۱۹۲۴ء

جب سے مستغنی کیا دل کی صفائی نے مجھے
دیتے ہیں تعلیم خود بینی یہ آئینے مجھے
میں اور آدابِ عبودیت بجا لاتا بھلا
کر دیا پابند آئینِ خدائی نے مجھے
اپنی قوت سے کیا ملکِ سخن زیرِ نگیں
فتح اس بازو نے دی اور اس کلائی نے مجھے
شششِ جہت آئینۂ حیرت بنے میرے لیے
کر دیا خود بیں کسی کی خود نمائی نے مجھے
میری صورت دیکھتے ہیں صبح اٹھ کر اہلِ دل
کر دیا آئینہ اس دل کی صفائی نے مجھے

اک کھٹک صبح ازل سے تھی برابر اے عزیزؔ
مار ڈالا اُ دل کی ویرانی نے مجھے

(۵۶)

۱۳؍جون ۱۹۲۴ء

یہ غلط ہے اے دلِ بدگماں کہ وہاں کسی کا گزر نہیں
فقط اس لیے یہ حجاب ہے کہ کسی کو تاب نظر نہیں

کھو کچھ حقیقت منتظر کہ مجھے کہیں کی خبر نہیں
یہ مناظرِ دو جہاں ہیں کیا جو فریب ذوقِ نظر نہیں

کسی آہ میں نہیں سوز جب، کسی نالے میں جب اثر نہیں
یہ کمالِ سوزشِ دل نہیں، یہ فروغ داغ جگر نہیں

چمک اُٹھ رہی ہے جو پے بہ پے، یہ تجلیوں کا خزانہ ہے
یہ ہجوم برقِ تپاں نہیں، یہ متاعِ دردِ جگر نہیں،

یہ ہے اہتمام حجاب کیوں، یہ ہے بندوبست نقاب کیوں
تمھیں آنکھ بھر کے میں دیکھ لوں وہ نظر نہیں وہ جگر نہیں

وہ رہینِ لذتِ غم ہوں میں نہ ملی ازل میں مئے طرب
میں ہی اس کرم کا تھا منتظر میں ہی مستحق تھا، مگر نہیں

کبھی دقتِ ناز و نیاز ہے، کبھی مجوز لطف ایاز ہے
مگر اس پہ بھی دلِ عزؔ نوی کرم آشنائے نظر نہیں

تعیناتِ نظام تجھے فقط ایک پردۂ ماسوا
خبر اس کی جب سے ہوئی مجھے کوئی اس جہاں کی خبر نہیں

تجھے کارگاہِ فنا بتا، انہی ہستیوں پہ غرور ہے،
جو شریکِ سود و زیاں نہیں، جو رہینِ نفع و ضرر نہیں

چمک اے چراغِ ضمیر اب کہ طلوعِ مہر کمال ہو
وہ لحد ہوں تیرہ و تار میں کہ جہاں بیاضِ سحر نہیں

نہ وہ سوز ہے نہ وہ ساز ہے، نہ وہ دل خزانۂ راز ہے
وہ شرر ہوں جس میں دھواں نہیں وہ جگر ہوں جس میں شرر نہیں

نظر اس کی ہے مری سمت ابھی، مرا دامنِ گہریں نہ دیکھ
ابھی خونِ دل ہے رکا ہوا، ابھی آنسوؤں سے یہ تر نہیں

چمک اے تجلّیِ دل رُبا! نکل اے خلاصۂ مدعا!
کہ نظارۂ دو جہاں فقط، یہ مآلِ ذوقِ نظر نہیں

یہ جبہہ سائیِ بے محل، مجھے شب گوشے رہی تھی خبر
نہ مٹا دے ظلمتِ دہر جو، وہ نشانِ سجدۂ در نہیں

یہ تغیراتِ جہاں نہیں، اثرِ تلوّنِ طبع ہے،
تری اک نظر کا کرشمہ ہے، یہ فلک کی گردشِ سر نہیں

کہو شمع سے کہ یہ نقل کیا، کوئی اپنا قصۂ غم کہے
کرے اب فسانے کو مختصر کہ مجھے اُمیدِ سحر نہیں

ہے تلاش اپنی فقط مجھے، میں ملوں تو ہوں گی شکایتیں
مجھے اب کسی سے گلہ نہیں، مجھے اب کسی کی خبر نہیں

یہی منزلیں ہیں وہ منزلیں کہ جہاں سے پناہ لے
دلِ ناشناسِ رہِ وفا مجھے کوئی خوف و خطر نہیں

مری غفلتوں کا گلا نہ کر، یہی نظم کون و فساد ہے
خبر اس طلسم نمود کی، مجھے ہو چکی ہے، مگر نہیں

سبق اس سے لے کہ خبر ملے تجھے آنے والے زمانے کی
ہے تغیرات کا آئینہ، یہ شکستہ کاسۂ سر نہیں

یہ ہیں وار تیری نگاہ کے، کسی ناتواں سے رکیں گے کیا
دلِ داغ داغ عزیز ہے، ستم آزمایہ سپر نہیں

(۵۷)

۱۵ر جون ۱۹۲۷ء

ساقیِ مست پاس ہے، جلوۂ ماہتاب ہے
بادۂ تند و تیز ہے، شیشۂ پُر گلاب ہے

بادہ کشی کی رات ہے، جمع ہے سازِ سلطنت
سر پہ ہے نورِ ماہتاب، سامنے ماہتاب ہے

بارِ گراں سے ہو سبک، خلوتیِ حریمِ قدس
قیدِ حیات سے نکل، بزم میں باریاب ہے

حالِ عزیزِ بادہ کش، کوثریوں سے پوچھ لو
رندِ ہزار شیوہ ہے، بندۂ بوتراب ہے

(۵۸)

۲۰ جولائی ۱۹۲۴ء

آغاز میں جو دل کو خوفِ مآل ہوتا
میں سرفراز ہو کر کیوں پائمال ہوتا

کاش اختیار وقتِ اظہارِ حال ہوتا
اپنی زبان ہوتی، اپنا خیال ہوتا

دل کو اگر بناتے آئینۂ محبت
حاضر جواب ہوتا، صورت سوال ہوتا

غالب اگر نہ ہوتا وحدت کا رنگ ہرتا
ہر فرد اس جہاں میں کیا بے مثال ہوتا

اے حسن و عشق تم میں اُس وقت صلح ہوتی
دونوں طبیعتوں میں جب اعتدال ہوتا

تربت پہ وہ کھڑے ہیں، ہم ہیں کہ محوِ غفلت
اے کاش عہدِ ماضی اس وقت حال ہوتا

اچھا کیا کہ آئے تم نزع میں سرہانے
جینا تو خیر جینا مرنا محال ہوتا

اخلاق کا عزیز اب نام و نشاں نہیں ہے
کیا اور اس سے زائد قحط الرجال ہوتا

(۵۹)

۲۵ر جولائی ۱۹۲۴ء

کون پھر اُس کے سوا موجود ہے　　جب وہی شاہد وہی مشہود ہے
دیکھنا اس کی طرف بے سود ہے　　رنگ رخسار آفتاب آلود ہے
تاب کس کو داستانِ دل سُنے　　حرف حرفِ عشق خوں آلود ہے
ایک ایک ذرّے پہ عبرت کی نظر　　مدعائے ہستی بے بود ہے
انکسار سر زمینِ کعبہ کیا　　ایک ایک ذرہ یہاں مسجود ہے
ظلم اتنے، انتہا جس کی نہیں　　پھر بھی اس سے دل مرا خوشنود ہے
حُسن کیا ہے؟ شعلۂ پُر پیچ و خم　　عشق کیا ہے؟ ایک موجِ دود ہے
حفظِ دنیا سے فانی رات دن　　زمزمہ سنج ہُوَ الموجود ہے
خاک اربابِ وفا سے محترز!　　دیکھ لے دامن غبار آلود ہے
سانس کا باقی ہے جب تک سلسلہ　　عافیت دل کے لیے مفقود ہے
تو مل جائے تو پھر کیا چاہیے　　اور کیا تیرے سوا مقصود ہے
دل خلیلِ امتحاں گاہِ وفا　　سوزشِ دل آتشِ نمرود ہے
دل نہ ہو جب تک کسی کا داغ داغ　　بارگاہِ عشق میں مردود ہے
ننگ ہے جینا تو کیا قبلِ موت　　خلقتِ دنیا مگر بے سود ہے

کشتۂ صد تیغ ناکامی عزیز
شکر ہو، حاسد نہیں محسود ہے

(۶۰)

۱۹۲۴ء

شب آخر، ہم بھی آخر، دیکھیے کب تک وہ آتے ہیں
بصارت گھٹتی جاتی ہے، چراغ اب جھلملاتے ہیں

تلاطم دل میں برپا ہے، قدم تھرائے جاتے ہیں
حریم ناز کا پہلے پہل پردہ اُٹھاتے ہیں

ثبات اپنا دکھایا شمع نے گو تیری محفل میں
مگر دیکھا تو شعلے کے قدم تھرائے جاتے ہیں

کسی کی انجمن میں جبر پر کیا اختیار اپنا
یہ عالم ہے کہ دل کے ساتھ ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں

مری کمزوریوں سے یہ جسارت ہے زمانے کی
قدم ہٹتے ہیں جب پیچھے، حوادث بڑھتے آتے ہیں

سمجھتا ہے دلِ بے تاب یہ بجلی چمکتی ہے
وہ رہ رہ کر حریم ناز کا پردہ اُٹھاتے ہیں

غبار اُٹھتا ہے، بھر دیتے ہیں جوشِ بندگی اتنا
زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے، جب ہم سر جھکاتے ہیں

مری ہستی ذرا دکھلا اُنھیں آئین خود داری
مجھے بھی دیکھنا ہے تجھ کو وہ کیونکر مٹاتے ہیں

ہوا سجدوں کے قابل اپنا آئین عبودیت
بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم سر جھکاتے ہیں

ازل کے روز اے فراش قدرت کہہ دیا ہوتا
زمیں پیدا نہیں کرتے صفِ ماتم بچھاتے ہیں

شب غم منحصر گریے پہ ہے اختر شماری بھی
جب آنسو ضبط کرتا ہوں، ستارے ڈوب جاتے ہیں

تمھاری حسرتِ تعمیر پر اے خاک کے پتلو!
شکستہ مرقد اب تک مقبروں میں مسکراتے ہیں

دلِ ویراں کو دیکھو، آسمانِ حسن کے تارو!
بتاؤ کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں

سلامِ آخری آشفتگانِ رفتنی تم پر
مبارک تم کو یہ سامانِ ہستی ہم تو جاتے ہیں

اُٹھیں گی وہ حیا پروردہ نگاہیں کیا مری جانب
مقابل ہے فقط آئینہ اور شرمائے جاتے ہیں

عزیزِ محترم کو اُن کی محفل خوب راس آئی
نکالے جاتے ہیں روز اور وہیں پھر پائے جاتے ہیں

(۶۱)

۸ر نومبر ۱۹۲۳ء

یہ دل کا داغ کسی دن اگر عیاں ہوتا
وہ آفتاب تھا جو تاجِ آسماں ہوتا

بتاؤ مفت میں جانوں کا کیوں زیاں ہوتا
جو امتحاں کے طریقے سے امتحاں ہوتا

مری زباں سے جو قصہ مرا بیاں ہوتا
یقین ہے کہ زمانہ ہی داستاں ہوتا

عروجِ ماہ ہی قدرت مقابلہ کرتی،
وہ ہوتے سامنے اور چاند بھی جواں ہوتا

ترے لیے ہیں مری مردہ حسرتیں کافی
غریب دل ترا ماتم بھلا کہاں ہوتا

مرے دہن میں مگر آپ کی زباں ہوتی
تو پھر کچھ اور ہی عنوانِ داستاں ہوتا

ہمیں تو خاک ہی ہونا تھا پھر شریکِ فشار
اگر زمین نہ ہوتی تو آسماں ہوتا

حقیقتِ دلِ زخمی بیاں نہ کر سکتا
ہزار سال گلستاں جو ترجماں ہوتا

۔ دائے حُسن کو جی بھر کے دیکھ تو لیتے
بلا سے جان کا ہوتا اگر زیاں ہوتا

چمن نہیں ہے سزا وار تجھ کو شایاں تھا
کہ بجلیوں کے نشیمن میں آشیاں ہوتا

ستارہ صبحِ قیامت کا ٹوٹ ہی پڑتا
جو میری آنکھ سے آنسو کوئی رواں ہوتا

سکوتِ موت کے قربان بگڑی بات بنی
وہ ہم زباں نہ ہوئے، کیوں نہ بے زباں ہوتا

تمھارے ظلم اُٹھانے کا جو رہا خوگر
وہ دل ستم زدۂ دورِ آسماں ہوتا؟

نہ پوچھ داورِ محشر فسانۂ ہستی
بیان کرتے اگر قابلِ بیاں ہوتا

حجابِ ناز میں پنہاں تمھارا زہستی کا
نقاب رُخ سے اُلٹتے تو میں کہاں ہوتا

زمیں خلاف، فلک منحرف، وہ چیں بہ جبیں
شکستہ دل، تری تربت کا کیا نشاں ہوتا!

اس انتشار میں مخفی ہے عظمتِ لیلیٰ
غبارِ قیس بھلا یوں رواں دواں ہوتا

نگاہِ ناز دمِ نزع کہہ گئی کچھ حال
تمام عمر کا قصہ تو کیا بیاں ہوتا

وہ سوزِ عشق، جہنم شرار ہے جس کا
نہاں کئے سے ہمارے بھلا نہاں ہوتا؟

شبِ فراق چراغاں کی تھی یہی صورت
عزیزؔ ہر سرِ مو چشمِ خوں فشاں ہوتا

(۶۳)

۲۲ر نومبر ۱۹۲۲ء

حجاب آرا رہے گا عکس کب تک روئے تاباں کا
چراغ اندھا جلا کرتا ہے دل میں داغ سوزاں کا

چٹک کر باغ میں کلیوں نے مشکل اپنی آساں کی
یہاں باقی ہے اب تک مرحلہ چاکِ گریباں کا

جنوں کی زندگی وابستۂ صحرا نوردی ہے
مگر ہے آبلوں کی رُوح ہر کانٹا بیاباں کا

مری جمعیّت خاطر ہے کیا، آشفتگی کیا ہے
سنورنا اور بگڑنا آپ کی زلفِ پریشاں کا

لکھے ہیں دل نے شب بھر زینت گیسو کے افسانے
لکھو کیوں تذکرہ چھیڑا پریشاں سے پریشاں کا

—

ہوائیں لے اُڑیں، وحشت سرا دُنیا نہ ہو جائے
جنوں زا ہے عزیزؔ اِک ایک تار اپنے گریباں کا

(۶۳)

۸ر دسمبر ۱۹۲۴ء

کیوں نہ ہو شوق ترے در پہ جبیں سائی کا
اس میں جو ہر ہے مری آئینہ سیمائی کا

طور کشتہ ہے اسی نازِ خود آرائی کا
برق کی لہر ہے نقشہ تری انگڑائی کا

عشق اِک تبصرہ ہے حُسن کی رعنائی پر
حُسن اک فلسفہ ہے عشق کی رسوائی کا

آج اِک خاک کا ذرّہ بھی نہیں باقی ہے
دلِ برباد یہ حاصل ہے خود آرائی کا

یاد ایام کہ تھی لب پہ مرے مہرِ سکوت
اب تو ماتم ہے بپا دل میں شکیبائی کا

موج در موج رواں بادۂ سرجوشِ شباب
عالمِ کیف ہے عالم تری انگڑائی کا

حسرت و یاس کا انبوہ، مگر میں بے کس
ایسے مجمع میں یہ عالم مری تنہائی کا

تیرگی شامِ لحد کی ہے بھیانک لیکن
ہے یہ اُترا ہوا جامہ شبِ تنہائی کا

جزر و مدِ حُسن کے دریا میں نظر آتا ہے
قابلِ دید ہے عالم تری انگڑائی کا

تیرے دیدار سے محروم رہیں جب آنکھیں
کوئی مصرف ہی نہیں پھر مری بینائی کا

عالمِ گورِ غریباں کا یہ غمناک سکوت
اِک نمونہ ہے مرے دل کی شکیبائی کا

نیند اُن کی اگر اُڑ جائے تو کچھ دور نہیں
سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

شعرِ دل کش ہو اگر صفحۂ کاغذ پہ عزیزؔ
اِک مُرقّع ہے کمالِ سُخن آرائی کا

(۶۴)

۱۴ر دسمبر ۱۹۲۴ء

کر چکے برباد دل کو، فکر کیا انجام کی
اب ہمیں مرنے دو، یہ مٹی ہی ہمارے کام کی

ڈوب مرتے بادۂ گل رنگ میں زاہد اگر
دیکھتے رنگینیاں پھر جامۂ اِحرام کی

عکس ابرو دیکھتے ہیں بادۂ سرجوش میں
عید ہے ساقی پرستوں میں ہلالِ جام کی

ابتدائے عشق ہے اور بجھ رہا ہے دل مرا
ہو چلی دھیمی ابھی سے لَو چراغِ شام کی

آنکھ میں آنسو ہیں ماتھے پر عرق ہے موت کا
لے خبر عشرؔ رواں اپنے چھلکتے جام کی

قطعہ

ہو گئی بازیچۂ اطفال بے ذوق و شعور
شاعری جو تھی مرادف معنی الہام کی

پختگی سمجھے ہوئے ہیں جو تناسب کو فقط
چاہیے اِصلاح ان کو اس خیالِ خام کی

ہے یہ نازک فن جو شایاں تھی مغربی نہیں
دورِ مجلس میں ضرورت کیا ہے خالی جام کی

ہے عزیزؔ آئینۂ لفظی مراعات النظیر
حُسنِ معنی جب نہیں پھر شاعری کس کام کی

---

(۶۵)

جنوری ۱۹۳۶ء

آنکھ جھپکائی یہاں حُسن خود آرائی نے
جھک کے اِک سجدہ کیا چشمِ تماشائی نے

جب کیا دَورِ مَے آغاز خود آرائی نے
بڑھ کے اِک دائرہ کھینچا تری انگڑائی نے

کر دیا نشۂ دو بالا تری انگڑائی نے
جام پر جام پیئے چشمِ تماشائی نے

نہ بدلنا تھا، نہ بدلا دلِ بے تاب کا رنگ
چرخ کھائے ہیں بہت گنبدِ مینائی نے

حشر میں جلوہ گہِ صبحِ ازل یاد آئی
مجھ کو گستاخ کیا تیری شناسائی نے

پردۂ برق میں اُو چھپ کے سنورنے والے
دُور سے بھانپ لیا چشمِ تماشائی نے

سُرمہ آلود نگہ ظالم مظلوم نُما
بند کر دی ہیں زبانیں تری گویائی نے

نشۂ حُسنِ جوانی تھا خود اِک چیز، مگر
بجلیاں اور گرائیں تری انگڑائی نے

ظلمتِ زلف سے تاب الٰہی توبہ
بھیس کس حُسن سے بدلا شبِ تنہائی نے
عشقِ بے برگ و نوا کو ہمہ تن زخم کیا
نگہِ ناز تری حوصلہ افزائی نے

جلوۂ رُخ سے منوّر تھا شبستانِ جمال
شمعیں دو اور جلا دیں تری انگڑائی نے
پھر بھی حسرت ہی کہ ہوتا میں کوئی نقشِ سکوت
گو کہ انسان بنایا مجھے گویائی نے

سر بسر پا تک مری ہستی تھی تجلّی کا ظہور
سب سے بیگانہ کیا اپنی شناسائی نے
عشق کو طاقتِ پرواز پہ تھا ناز بہت
خوب پھینکی ہے کمند آپ کی انگڑائی نے

دل کو اے حسن کی محفل میں بچانے والے
توڑ ڈالے گئے ہیں ایسے بہت آئینے
سجدۂ عام سے ہوتی ہے کوئی شے مسجود
کعبہ اُس در کو کیا میری جبیں سائی نے
روند ڈالا ہے ستاروں کی بھری محفل کو
پائے پُر آبلہ کی بادیہ پیمائی نے

اس تجاہل سے وہ بیگانہ روش اچھے تھے
ناشناس ان کو بنایا ہے شناسائی نے

سانس کیا لے گا کوئی کشتۂ انداز خمار
توڑ دیں دل کی رگیں آپ کی انگڑائی نے

کر دیا ایک صنم خانۂ عصیاں آباد
بُت تراشے ہیں یہاں تک مری گویائی نے

کر دیا بزم کواکب کو نمود بے بود
دل پُر داغ تری انجمن آرائی نے

نہ ہوئی سعی ہماری کوئی مقبول عزیزؔ
کر دیا خون دل اُمید پزیرائی نے

قطعہ

شعر کہنے کا سلیقہ نہ سمجھنے کا شعور
کر دیا کاہل فن قافیہ پیمائی نے

غالبؔ و میرؔ کی مسند پہ دیا اُن کو فروغ
ناشناسوں کی فقط حوصلہ افزائی نے

کوئی مرکز نہ رہا کوئی مسلم نہ رہا
سب کو اُستاد کیا ہمت خود رائی نے

خوب دکھلائے گئے تیغِ زباں کے جوہر
فن کو مجروح کیا طاقتِ گویائی نے

نئی اُردو ہے، نیا طرز، نئی ترکیبیں
نئی محفل ہے، نیا رنگ، نئے آئینے

شاہدِ نظم کے رُخ پر وہ نقابیں ڈالیں
پھیر لی اپنی نظر چشمِ تماشائی نے

بزم میں اپنی مثال ان کو نظر کیا آئے
آئینے توڑ دیے دعویِٰ یکتائی نے

شاعری اور خطابت میں نہ سمجھے کچھ فرق
بے خبر ان کو رکھا انجمن آرائی نے

(۶۶)

۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء

غلط ہے، دل پہ قبضہ کیا کرے گی، بے خودی میری
یہ جنس مشترک ہے، جو کبھی ان کی کبھی میری

حجاب اُٹھتے چلے جاتے ہیں اور میں بڑھتا جاتا ہوں
کہاں تک مجھ کو لے جاتی ہے دیکھوں بے خودی میری

توہم تھا مجھے، نقشِ دوئی کس طرح مٹتا ہے
نقابِ رُخ اُلٹ کر اس نے صورت کھینچ دی میری

اِدھر بھی اُڑ کے آ، خاکسترِ دل منتظر میں ہوں
لگا لوں تجھ کو آنکھوں سے تو ہی ہے زندگی میری

عزیز اِک دن مجھے یہ راز داری ختم کر دے گی
کسی نے بات اُدھر کی اور رنگت اُڑ گئی میری

(۶۵)

۱۰ر جولائی ۱۹۲۵ء

جلایا کیسی ہمدردی سے دل سوزِ محبت میں
تصرّف کا تھا کیا حق مجھ کو قدرت کی امانت میں

کہیں خورشیدِ محشر اشکِ خوں بن کر نہ گر جائے
چھڑی ہے داستانِ دردِ دل صحنِ قیامت میں

مرا مرنا، تمہاری بے رُخی، احباب کے طعنے
یہ نقشے حشر تک باقی رہیں گے چشمِ عبرت میں

ہر اک ذرّے کے دل میں بھر گیا جوشِ انا اللّٰہی
یہاں تک حسن نے کی سعی جلووں کی اشاعت میں

ستم کی مشق میں اندیشۂ فردا نہ کر ظالم
غریبوں کی سُنے گا کون آشوبِ قیامت میں

دلِ نا عاقبت اندیش، کیوں جوشِ مسرّت ہے
صدائے نغمۂ ماتم بھری ہے سازِ عشرت میں

عزیزؔ ایسے بھی اربابِ سخن اس دور میں دیکھے
نہ سمجھے فرق کوئی شاعری میں اور خطابت میں

(۶۸)

۱۰ر جون ۱۹۲۵ء

پرتوِ حسن کہیں انجمن افروز تو ہو
دلِ پُر داغ مرا مایۂ صد سوز تو ہو

کم سے کم کوئی تو ساماں ترے آنے کا کروں
اطلسِ چرخ تو ہو، بسترِ گل دوز تو ہو

رنگ پیرائے چمن جوش میں کلیاں چٹکیں
کھول دے بندِ نقاب آج کہ نوروز تو ہو

دل میں پیوست نہ ہو جو وہ نظر ہی کیا ہے
تیر ترکش میں اگر ہو تو جگر دوز تو ہو

نہ سہی صحبتِ فردوس، جہنم ہی سہی
محفلِ عیش نہ ہو، انجمن سوز تو ہو

کیا نتیجہ ہے عزیزؔ ایسی جبیں سائی سے
بُت کا سجدہ ہو مگر ناصیہ افروز تو ہو

(۶۹)

۱۰ر جولائی ۱۹۲۵ء

جہاں ہے پست ملائک کی ہمّتِ عالی
وہاں پہ لیتی ہے دم میری بے پر و بالی
ملے ہیں خاک میں پروردۂ نسیم بہار
کوئی ثمر نہ ملا مجھ کو باغ کے مالی
نہ خونِ دل کے ہیں قطرے نہ لخت ہائے جگر
بہت خجل ہوں کہ دامانِ عشق ہے خالی
اسیرِ زلف ہوا ہے تو کیا خوشی اس کی
یہ سرفرازیٔ دل ہے نوید پامالی
کوئی سوال نہ کر روزِ حشر کے مالک
ہیں میرے دیدۂ و دل مجرمانِ اقبالی
بساطِ وسعتِ کونین کی حقیقت کیا
کسی فسانہ طلب کی نگاہِ اجمالی
رہیں گے سایۂ دیوارِ یار میں کب تک
عزیز آبلہ پا مدظلہ العالی

---

(۷۰)

۱۵ر مئی ۱۹۲۵ء

تکمیلِ محبّت کا قرینا نہیں آتا
جیتے تو ہیں لیکن ہمیں جینا نہیں آتا

ہوتا ہے رفو یوں بھی کہیں زخمِ جگر میں
اے سوزنِ مژگاں تجھے سینا نہیں آتا

اب ہر بُنِ مو سے ہیں رواں خون کی دھاریں
آتا بھی ہے اور مجھ کو پسینا نہیں آتا

اندیشۂ طوفاں سے فراغت نہیں دل کو
جب تک کہ کنارے پہ سفینا نہیں آتا

ہر حلقے میں ممتاز کرے گی تجھے تہذیب
بے ترشے انگوٹھی پہ نگینا نہیں آتا

اس راز سے واقف ہیں عزیز اہلِ محبت
مرنا بہت آسان ہے، جینا نہیں آتا

(۷۱)

۱۶ر مئی ۱۹۲۵ء

میرے دل میں کوئی ہم راز اور ہے　　سن رہا ہوں، ایک آواز اور ہے

شہپرِ جبریل سے نسبت ہے کیا
طائرِ دل تیری آواز اور ہے
روح پرور ہے دمِ عیسیٰ مگر
اس لبِ مے گوں کا اعجاز اور ہے
اور شے ہے شورِ ہنگامِ نشور
وہ خرامِ فتنہ پرداز اور ہے
کیفِ چشمِ مست ہے اک اور چیز
بادۂ صافیٔ شیراز اور ہے
سرحدیں ہیں عام، ازل ہو یا ابد
میرا انجام اور آغاز اور ہے
چنگِ مطرب سے علاقہ دل کو کیا
یہ مرا ٹوٹا ہوا ساز اور ہے
شاعری کیفِ جوانی تھی عزیزؔ
اب تو رنگِ طبعِ ناساز اور ہے

(۴۲)

۱۰ فروری ۱۹۲۶ء

محروم ہوں وصال سے گو باریاب ہوں
خلوت نشینِ ناز ہے وہ میں حجاب ہوں

پیری! مری حیات کو برباد یوں نہ کر
پروردۂ نسیم بہارِ شباب ہوں
اُس کی کسی ادا کا نہیں ہے کوئی قصور
تیرا ہی کشتہ اَے دلِ خانہ خراب ہوں
عیشِ جہاں کو جان رہا ہوں کہ ہے بقا
اپنے خیالِ خام کا خود ہی جواب ہوں

(۷۴)

۱۹۲۶ء

الحذر! یہ دل اُسی کا فرشِ پا انداز ہے
بجلیوں کی رَو میں جو مستِ خرامِ ناز ہے
سازِ نیرنگِ جہاں بھی کیا انوکھا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے
دم رگوں سے کھنچ رہا ہے اور اجل دمساز ہے
اُس کا کیا انجام ہوگا جس کا یہ آغاز ہے
عقدے کو لاحل بناتی جاتی ہے فطرت اُدھر
ناخنِ تدبیر اِدھر وقفِ کشودِ رَاز ہے
گو لگا دی موت نے لب پر مرے مہرِ سکوت
میری خاموشی میں لیکن دل شکن آواز ہے

تنگیِ دل سے صدا نکلے تو کچھ تاثیر ہو،
ورنہ یوں تو ہر کلی کے مُنہ میں بھی آواز ہے
آگئی وہ فصلِ گل، وہ لے اُڑا جوشِ جنوں
جنبشِ موجِ ہَوا مجھ کو پرِ پرواز ہے
انتظارِ موت میں دن کاٹتا ہوں زیست کے
زندگی اب میرے مقصد میں خلل انداز ہے
نازِ ساقی کون اُٹھاتا ہے خمارِ شوق میں
ایک ہی انگڑائی میں درِ مے کدے کا باز ہے
جارہا ہوں سامنے عرضِ تمنّا کے لیے
اشک آنکھوں میں ہیں بھرّائی ہوئی آواز ہے
حُسن کی خود داریاں کب تک حجابِ ناز میں
میں صدا دیتا ہوں تم کو، یہ مری آواز ہے
دل میں جو کچھ تھا وہ آخر لے اُڑی موجِ شمیم
جامۂ ہستی سے باہر اب گلوں کا راز ہے
انتہا دل کی رسائی کی کسے معلوم ہو
یہ بھی کیا روح الامیں کی طاقتِ پرواز ہے
نزع میں ہلتے ہیں میرے ہونٹ، سنیے غور سے
یہ مری آواز ہے یا آپ کی آواز ہے

نغمۂ غم کے سوا اس ساز میں کیا ہے عزیز
عالم اِک ٹوٹے ہوئے دل کی مگر آواز ہے

(۶۴)

عشق کا ہم راز ہے اور حُسن کا دم ساز ہے
یہ دلِ تاراج دیدہ مدفنِ صد راز ہے
گو نجتی تھی دل میں کل تک وہ صدائے دل نشیں
آج پیمانِ ازل اک دُور کی آواز ہے
بارگاہِ حُسن میں کیا چیز ہو اب پیش کش
گریۂ خونیں بھی میرا جب نظر انداز ہے
اللہ اللہ! سرگزشتِ حُسن کی رنگینیاں
حرف حرف اس داستاں کا زمزمہ پرداز ہے
جل کے پروانوں نے طاقت اپنی دے دی حُسن کو
شمع کا شعلہ نہ سمجھو، یہ پرِ پرواز ہے
آ رہی ہے آج میرے دل سے پیہم اک صدا
یہ تو جیسے میری پہچانی ہوئی آواز ہے
جانتا ہوں میں فریبِ عشرتِ پا در رکاب
خاک ہوں اور خاک میری زندگی کا راز ہے

آہ! بازوے شکستہ، صبر تیری جان پر
سامنے گلزار ہے اور در قفس کا باز ہے

چھیڑ اے مضرابِ دل اور سُن صدائے دل نواز
نغمۂ پنہاں ہے وہ، نقشِ جہاں اک ساز ہے

آرزوے سیرِ گلشن اب تو ہے دیوانگی
بال و پر ٹوٹے ہوئے اور حسرتِ پرواز ہے

کچھ نہ پوچھ ان سونے والوں کی خموشی کا سبب
عالمِ گورِ غریباں اِک نگہ کا راز ہے

کام دیں گی کیا نگاہیں خلوتِ اسرار میں
بس سُنا کیجیے، فقط آواز ہی آواز ہے

سُن رہے ہیں سر نکالے آشیانوں سے طیور
کون اس کُنجِ قفس میں زمزمہ پرداز ہے

بُلبلیں کہتی ہیں سُن سُن کر یہ اشعارِ عزیزؔ
ہند میں اک ہم نوائے حافظِ شیراز ہے

(۴۵)

۱۰ر جون ۱۹۲۶ء

خانۂ دل حُسنِ رخ سے گھر گیا | ہر طرف سونے کا پانی پھر گیا
قہر ڈھاتی ہے کسی کی بے رُخی | جب نظر پھیری زمانہ پھر گیا

تیرا کیا کہنا جمالِ ہم نشیں — جو ترے پہلو میں بیٹھا تر گیا

کیا کیا اشکِ ندامت کیا کیا — میں خود اپنی ہی نظر سے گر گیا

آتشِ تر سے دھواں اُٹھنے لگا — کاگ اُڑے بوتل سے، بادل گھر گیا

کیا تعلق تھا عزیزؔ اُناؤ سے

دل طلسماتِ اثرؔ[1] میں گھر گیا

(۸۶)

۱۰ نومبر ۱۹۲۶ء

اِن نگاہوں کا نشانہ ہیں ستم ایجاد بھی

ناوک افگن جھک چلا ہے چرخِ کج بنیاد بھی

ہے دو رنگی کا نمونہ عالمِ ایجاد بھی

نوحۂ غم بھی ہے اور شورِ مبارک باد بھی

میرے دل کی داستاں میں مختلف عنواں ہیں

ایک سُرخی اس کی ہے خونِ سرِ فرہاد بھی

آپ ہی نے خاک کا پُتلا بنایا تھا مجھے

آپ ہی کے ہاتھ سے مٹی ہوئی برباد بھی

عشق نے کیں خونِ دل سے جا بجا گُل کاریاں

ورنہ اِک سادہ ورق تھا عالمِ ایجاد بھی

---

[1] نواب جعفر علی خاں اثر

ہم گرفتارِ چمن، نیرنگ ہستی کیا کہیں
سرو کے مانند ہیں پابند بھی آزاد بھی

دیکھ کر گورِ غریباں دل کو سکتا ہو گیا
واہ ری بستی کہ ہے آباد بھی برباد بھی

عشق کی منزل ہے مانا جادۂ راہِ نجات
ہر قدم پر ہے مگر افتاد پر افتاد بھی

مجھ سے شاکی ہیں مری ناعاقبت اندیشیاں
آپ اسیرِ دام ہوں اور آپ ہی صیاد بھی

دل مرا کیا ہے، طلسمِ غنچۂ سربستہ ہے
ضبط کا پابند بھی اور حسرتِ فریاد بھی

حضرتِ ناصح! مری مجبوریاں کیجے معاف
واجب التعمیل تھا گو آپ کا ارشاد بھی

اِک زمانہ ہو گیا کھوئے ہوئے دل کو عزیز
یاد کیا دلواؤں ظالم کو جب آئے یاد بھی

(۷۷)

شامِ فراق ذکرِ جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی جو ایک کہانی میں کٹ گئی

اب انتظار کیا ہے تجھے اے حریصِ عیش
پیری بھی انتظار جوانی میں کٹ گئی

دل چسپ و دل فریب ہے کیا عیش بے ثبات
دُنیا کی عمر ایک کہانی میں کٹ گئی

آنکھوں کو شغلِ گریہ ہمیشہ رہا عزیز
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

(۷۸)

۱۷ر جنوری ۱۹۲۷ء

ضبط حکمِ عشق تھا، دل تابعِ احکام تھا
ورنہ یہ طبقے اُلٹ دینا بھی کوئی کام تھا

حُسن تھا، صبحِ ازل تھی، نور کا ہنگام تھا
ذرّے سب تو دے رہے تھے، جلوہ اتنا عام تھا

ہاتھ میں مخمور ساقی کے چھلکتا جام تھا
چودھویں کا چاند غرقِ بادۂ گُل فام تھا

دل نے جب تک اُن نگاہوں سے نہ کھایا تھا فریب
جنبشوں پر جنبشیں، پیغام پر پیغام تھا

میری مشتِ خاک بھی تھی اِک تباہی کا پیام
عشق کے آغاز کا یارب یہی انجام تھا

فصلِ گُل کا راز سمجھا عشقِ خونیں پیرہن
پردہ ہائے رنگ و بو میں حُسن کا پیغام تھا

روحِ فطرت مضطرب تھی، ذرّہ ذرّہ مشتعل
دل کی خلقت جب ہوئی تھی وہ بھی کیا ہنگام تھا

عشق کا دفتر ہوا نقشِ سویدا پر تمام
خاتمے پر مُہر تھی اور مُہر پر اک نام تھا

حُسن کا ہر جلوہ نامحدود، سرشارِ جمال
مبتدائے بے خبر، آغاز بے انجام تھا

ہیچ تھیں نیرنگیاں مینائے نیلی فام کی
موج زن شیشے میں جب تک بادۂ گلفام تھا

کوئی ایسے خط کھُلے لاتا ہے، کیوں اے برقِ طور؟
کس قدر طاقت رُبا، ہمت شکن پیغام تھا

سر کے بل چلنا پڑا آخر دیارِ عشق میں
ذرّے ذرّے پر خدا شاہد کسی کا نام تھا

موت کو جو مرنے والا جانتا تھا زندگی
اُس پر آخر زندگی کا کس لیے الزام تھا

رُخ سے سرکانا نقاب اور جان دینا بے طلب
وہ تمہارا کام تھا اور یہ ہمارا کام تھا

برق کے پردے میں اوجھل ہو گیا آنکھوں سے تو
مُنہ چھپا کر جانے والے مجھ کو تجھ سے کام تھا

بارگاہِ حُسن تک پہنچا تو کیا دیکھا عزیزؔ
اِک نظر تھی کارفرما اور قتلِ عام تھا

(۷۹)

کامیابی ایسی صورت میں خیالِ خام تھا
ہم کو دل سے کام تھا اور دل کو اُن سے کام تھا

دل کے عقدے اس طرح کُھلتے ہیں، کھلتے ہیں اگر
ہچکیوں میں نزع کی یہ آخری پیغام تھا

رہ نوردِ عشق اگر ہوتے نہ پابندِ ادب
عرصۂ عالم بقدر وسعتِ یک گام تھا

غم کشوں کی داستانیں جب مرتب ہو چکیں
اُس صحیفے میں مقدّم سب سے میرا نام تھا

تو وہ شعلہ، جو ہمیشہ سے بھڑکتا ہی رہا
میں وہ انگرا، جس کو خاکستر ہی میں آرام تھا

(۸۰)

۳۰ر جنوری ۱۹۲۹ء

دیدار کا لطف اے دلِ بے تاب وہیں تھا
ہر جلوۂ مستانہ جہاں چیں بہ جبیں تھا

دُنیا کو مٹایا ہے اِسی طرزِ عمل نے
جو دل میں ہمارے تھا زباں پر وہ نہیں تھا

گردوں کی کمر روزِ ازل خم ہوئی جس سے
میں تھا کہ اِسی بارِ امانت کا امیں تھا

صورت کا تغیّر ہے فقط فرقِ مجازی
جو دید کا طالب ہے، وہی پردہ نشیں تھا

تھی آپ کے آنے کی تمنّا مرے دل میں
مفہوم قیامت کا مگر ذہن نشیں تھا

طوفاں کے تھپیڑوں میں تھا جس وقت سفینہ
اے منکرِ حق کون ترے ذہن نشیں تھا

میں نے جو دمِ نزع عزیز ایک نظر کی
عالم ہمہ تن اک نفسِ بازپسیں تھا

---

(۸۱)

نومبر ۱۹۲۶ء

مصحفِ عارض پہ وہ زلفیں پریشاں کر چکے
اِک ادا میں ختم بحثِ کفر و ایماں کر چکے

شق ہوئی دیوارِ زنداں، کھل گئی زنجیرِ پا
رہ نوردانِ جنوں عزمِ بیاباں کر چکے

اُن کو کیا خطرہ اگر تاریکیاں بڑھتی رہیں
ہر نفس کو اپنے جو شمعِ فروزاں کر چکے

پھر بھڑک اُٹھا وہی اک شعلۂ پرپیچ و تاب
جب مرتب دل کے اجزائے پریشاں کر چکے

مژدہ اے دل! ہوگئے فارغ بہارِ باغ سے
دیدۂ خوننابہ افشاں کو گلستاں کر چکے

واعظو! بنیادِ کعبہ میں بتوں کی ہستیاں!
ہم مسلماں ہو چکے اور تم مسلماں کر چکے

دیکھ لی مستیوں میں تیرے سونے کی ادا
بادہ کش نظارۂ صبحِ گلستاں کر چکے

ایک اک ذرّے سے صحرائے جنوں پیدا ہوا
میری مشتِ خاک کو جب وہ پریشاں کر چکے

اب رُخِ زیبا کو دیکھو جا کے پیشِ آئینہ
خود بھی حیراں ہو چکے، مجھ کو بھی حیراں کر چکے
دین سے مطلب، نہ دُنیا سے غرض کوئی عزیزؔ
دونوں عالم اک نظر پر اس کی قرباں کر چکے

(۸۲)

۲۱ر دسمبر ۱۹۲۶ء

منتشر ہیں ورق زمانے کے
اُف رے انداز مسکرانے کے
رنگ اب اور ہیں زمانے کے
دن گئے ہمّت آزمانے کے
اپنا کعبہ الگ بنائیں گے
معتکف ان کے آستانے کے
عرش کو فرش راہ پاتے ہیں
جبہ سایانِ تیرے آستانے کے
ایک پرتو ترے تلوّن کا
اختلافات ہیں زمانے کے
کب نگاہِ عتاب اُٹھے گی
مدعی تیغ آزمانے کے
دیکھ لیں کاش غور سے مجھ کو
آرزو مند دل لگانے کے
زینتِ زلف و رُخ پہ کیا موقوف
سو بہانے ہیں اک نہ آنے کے
میری نظروں میں وسعتِ کونین
دو ورق ہیں مرے فسانے کے
میں ہوں خود اپنا عیب ہیں کہہ دو
نکتہ چینوں سے اس زمانے کے
اکبرؔ، اقبالؔ، حسرتؔ اور عزیزؔ
معتبر ہیں یہ اس زمانے کے

بجلیاں بن کے گر رہے ہیں عزیزؔ
خار و خس میرے آشیانے کے

(۸۴)

عالم مجھے ہلکا سا پردا نظر آتا ہے
اس پردے کے اندر اک جلوا نظر آتا ہے
کب راہ ہو طے دیکھیں اور کیا نظر آتا ہے
اب تک تو پسِ پردہ، پردا نظر آتا ہے
شاید کسی بے کس سے اب ضبط نہیں ممکن
کچھ رنگ زمانے کا بدلا نظر آتا ہے
لو صبح ہوئی رُخ سے سرکائے گئے گیسو
خورشید کا پیمانہ چھلکا نظر آتا ہے
اللہ ری دلچسپی آرائشِ ہستی کی
مجھ کو تو کچھ اس میں بھی دھوکا نظر آتا ہے
کرتا ہوں تصوّر جب میں دل کی تباہی کا
تا حدِّ نظر مجھ کو صحرا نظر آتا ہے
تم لاکھ چھپو لیکن چھپنے سے ہے کیا حاصل
بے تابِ تماشا خود جلوا نظر آتا ہے

اِک نور پہ نازاں ہے گردوں، مجھے ہر شے میں
خورشید بہ دامن اک جلوا نظر آتا ہے

یہ کہہ کے مسل ڈالا انگشتِ حنائی سے
دل صفحۂ ہستی پہ دھبا نظر آتا ہے

کب رنگ وفا ابھرا عالم کے مرقع میں
یہ دفترِ پارینہ سادا نظر آتا ہے

زیبا اِسی قامت پر ہے دعوئے یکتائی
جو عالمِ کثرت میں تنہا نظر آتا ہے

بیمار شبِ غم کی پلکوں پہ اِک آنسو ہے
یا صبحِ قیامت کا تارا نظر آتا ہے

وہ سامنے ہیں پھر بھی جلوے ہیں حجاب آرا
اس پردہ دری میں بھی پردہ نظر آتا ہے

آنکھوں کو عزیز آخر برباد کیا دل نے
جب کیا نظر آتا تھا، اب کیا نظر آتا ہے

(۸۴)

۶ر جنوری ۱۹۲۶ء

سکوں ہر درد کو ملتا ہے میرے قلبِ مضطر میں
قرار اس بے قراری پر ہے موجوں کو سمندر میں

معاذاللہ! عکسِ روئے ساقی آتش تر میں
شعاعیں جام بر کف، آفتاب اُترا ہے ساغر میں

نگہ صد مئے کدہ در دست و ساقی محوِ خودداری
یہ منظر دیکھتا ہوں جب تو کیا رکھا ہے ساغر میں

ازل میں شعلہ اِک نکلا تھا ہنگامِ جبیں سائی
وہی چنگاریاں ہیں آج تک محفوظ پتھر میں

مفصل زندگی پر مختصر سا تبصرہ سمجھو
دمِ آخر جو اِک آنسو رُکا ہے دیدۂ تر میں

وہ چالیں چل، حریفوں کو نہ تجھ سے بدگمانی ہو
بساطِ دہر اے غافل! اُلٹ جائے گی دم بھر میں

ہم اس منزل کے رہرو ہیں جہاں مٹنا نہیں ممکن
اُبل آتا ہے چشمہ زندگی کا ایک ٹھوکر میں

تباہی کا وہ حصّہ جو ہوا تقسیم عالم پر
اسے بھی لکھ دیا ہوتا ہمارے ہی مقدر میں

بہار آئی، بڑھایا جوشِ سودا لالۂ و گل نے
جگر کی چوٹ اُبھری، اِک دھمک پیدا ہوئی سر میں

مری عقدہ کشائی سے دم اس کا بھی اُلجھتا ہے
یہ کیسے پیچ یارب پڑ گئے میرے مقدر میں

قطعہ

غزل اک دائرہ تھا عشق کے ماتم نصیبوں کا
مگر پا کوبیِ احباب سے ہے اب وہ چکر میں
بتاؤں آپ کو کیونکر جو فرقِ امتیازی ہے
شکستِ دل کی آواز اور صدائے روح پرور میں

جسے کہتے ہیں دردِ جاں گزا، وہ دل کا حصہ ہے
شرر رقصاں ملیں گے صرف مجمر اور پتھر میں
عزیزؔ اشعار میرے رقص کاغذ پہ کریں کیونکر
یہاں تو بس وہی سودا ہے دردِ عشق ہے سر میں

(۸۵)

تلاشِ رہ نما میں کوششیں ہیں رائگاں میری
وہی ہے حدِ منزل، سانس رک جائے جہاں میری
وہی چاکِ گریباں، اور وہی گل کاریِ داماں
چمن ہر سال دوہراتا رہے گا داستاں میری
بجھے گا وہیں تک سلسلہ آغازِ ہستی کا
جہاں پر ختم کر دیں کہنے والے داستاں میری
حقیقت اس قدر ہے عالمِ باقی و فانی کی
وہ استقلال تیرا اور یہ سعیِ رائگاں میری

فنا ہونا کسی کی سرد مہری سے تعجب کیا
محبّت کی حرارت تھی فقط روحِ رواں میری

اسی کو سازِ ہم آہنگ حسن و عشق کہتے ہیں
تری آواز کے پردے میں نکلی ہے فغاں میری

بتا! سربستہ غنچے اب چٹکنا کس سے سیکھیں گے
چمن آرائے فطرت بند ہوتی ہے زباں میری

عزیزؔ اب میں چراغِ کشتۂ گورِ غریباں ہوں
یہ عالم سو گیا ہے سنتے سنتے داستاں میری

(۸۹)

چشمِ ساقی کا تصوّر بزم میں کام آگیا
بھر گئی شیشوں میں مے، گردش میں خود جام آگیا

مضطرب دل اک تجلّی میں فقط کام آگیا
ابتدا ہی میں خیالِ عبرتِ انجام آگیا

حسن خود آرا نہ یوں ہوتا حجاب اندر حجاب
شانِ تمکیں کو خیالِ منظرِ عام آگیا

حُسن نے اتنا تغافل میری ہستی سے کیا
رفتہ رفتہ زندگی کا مجھ پہ الزام آگیا

انتظار اب شاق ہے اے ساقیِ پیماں شکن
گھر گئے بادل، صراحی آ گئی، جام آ گیا

ہم تو سمجھے تھے سکوں پائیں گے بے ہوشی کے بعد
ہوش جب آیا تو پھر لب پر ترا نام آ گیا

خاک آخر ہو گیا سب ساز و سامانِ حیات
کیوں دلِ برباد حسرت اب تو آرام آ گیا

ہو گئی آسودگی، جھگڑا چکا، راحت ملی
ناتواں تھا دل، نبردِ عشق میں کام آ گیا

دل نے کی پیری میں پیدا غفلتِ عہدِ شباب
صبح کا بھولا جو منزل پر سرِ شام آ گیا

پردۂ دُنیا میں اب بے سود ہیں یہ کوششیں
اے فریبِ آب و دانہ! میں تہِ دام آ گیا

رندِ مستغنی ہیں، دُنیا سے غرض ہم کو عزیز
دولتِ جم مل گئی جب ہاتھ میں جام آ گیا

(۸۷)

دیکھنا کیا تھا، دکھائی دے رہا ہے کیا مجھے
اب نگاہیں بھی مری دینے لگیں دھوکا مجھے

اے نگاہِ شوق، تو نے کر دیا رسوا مجھے
اُس نے دیکھا اور اُسی انداز سے دیکھا مجھے

موج زن تھا بحرِ ہستی، جب تک آنکھیں بند تھیں
اک سرابِ نیستی تھا، ہوش جب آیا مجھے

یہ ڈروّنی قبر کی منزل، یہ جائے تنگ و تار
چھوڑے جاتے ہو کہاں اے دوستو تنہا مجھے

اپنے دامن میں چھپا لے ایک مشتِ خاک کو
کون ہے اے وحشتِ غربت پوچھنے والا مجھے

ضبط سے کیا فائدہ، اکسیر بننا چاہیے
ہاں بھڑک اے شعلۂ دل اور جلاتا جا مجھے

واہ ری قسمت کہ محشر بھی نہیں جائے اماں
پھر نظر آیا وہی ہنگامۂ دنیا مجھے

میری بربادی تجلّی کی نہیں منّت پذیر
وادیِ ایمن ہے خاکِ دل کا ہر ذرّا مجھے

کثرت آرائے مظاہر، اس قدر جوشِ نمود
بندگی کے واسطے کافی تھا اک جلوا مجھے

جب دلِ بے تاب میں تابِ تحمّل ہی نہ تھی
حاملِ بارِ امانت کیوں بنایا تھا مجھے

بےکسوں کی قبر پر گزرا جو کوئی راہ رو
شمع کشتہ سے صدا آئی جلاتا جا مجھے
قصۂ عہدِ جوانی پوچھتے کیا ہو عزیز
آ گیا تھا اتفاقاً نیند کا جھونکا مجھے

(۸۸)

نقشِ ہستی پرتوِ فانی نظر آیا مجھے
حسنِ دل کش نے دکھایا ایسا آئینا مجھے
شب کے سناٹے میں ہر تارے پہ دھوکا تھا مجھے
دیکھتا ہے جیسے کوئی دیکھنے والا مجھے
پرتوِ نورِ ازل دکھلائے ہر ذرّا مجھے
چاہیے اس طرح سیرِ وسعتِ دُنیا مجھے
اب یہ عالم ہے کہ کوئی دیکھ سکتا ہی نہیں
دیکھنے والے یہ تو نے کس طرح دیکھا مجھے
کھُل گئیں دل کی رگیں، آنکھوں سے بہہ نکلا لہو
ایک انگڑائی میں تو نے کر دیا رسوا مجھے
چشمِ ساقی سے ہے محرومیِ قسمت کا گلا
بادۂ پُرکیف سب کو مل گیا، اِلّا مجھے

مضطرب دل، تیری ہر کروٹ سے ہے پیغامِ وصال
کم نہیں دریا سے ہرگز موجۂ دریا مجھے

دیکھ لی میں نے سجاوٹ انجمن کی دیکھ لی
اپنا جلوہ تو دکھا اے انجمن آرا مجھے

ذرّے ذرّے میں ہے طوفانِ حوادث موج زن
کچھ بتا اِس ہستیِ موہوم کا منشا مجھے

تنگ تھا مجھ پر قفس، کیا جانیے کیسی بنی
ہم صفیرو! اک ذرا آواز تو دینا مجھے

کیا کرامت ہے جو ٹپکا دیدۂ تر سے لہو
چاہیے تھا آسماں سے خون برسانا مجھے

عالمِ کثرت میں ہے وحدت کا جلوہ اے عزیزؔ
ایک اک ذرّے پہ کرنا چاہیے سجدہ مجھے

(۸۹)

کیوں چارہ ساز آئے ہیں بے کار کے لیے
اب تو دعا کا وقت ہے بیمار کے لیے

وحشت سے میری دشتِ جنوں سرفراز ہے
ہر آبلہ ہے تاج، سرِ خار کے لیے

یہ تو بہ تو حجاب ہیں، یہ تہ بہ تہ نقاب
صرف امتحان طالب دیدار کے لیے

دوزخ کی اس دہکتی ہوئی آگ کا مآل!
کافی تھی اک نگاہ گنہ گار کے لیے

شب کا سکوت، دل کا خلوص، آنسوؤں کے تار
کیا نعمتیں ہیں دیدۂ بیدار کے لیے

وہ تیری اک نگاہ سیاست، خدا گواہ
دوزخ سے سخت تر ہے گنہ گار کے لیے

یہ آبلے، یہ درد، یہ زخم جگر خراش
کافی نہیں ہیں لذت آزار کے لیے

اُٹھی تھی چشم شوق کہ بے نور ہو گئی
رونا ہے اب تو طاقت دیدار کے لیے

پیغام لا رہے ہیں حیات دوام کا
یہ آخری نفس، ترے بیمار کے لیے

جوش[1] و اثر، رواں و جگر، کیفی و نشاط
یہ گل ہیں میرے گلشن بے خار کے لیے

---

[1] جوش ملیح آبادی، نواب جعفر علی خاں اثر، جگت موہن لال رواں
شیام موہن لال جگر بریلوی، کیفی لکھنوی،

سیراب ہیں عزیزؔ مرے آبلوں سے دشت
ابرِ کرم ہوں وادیٔ پُرخار کے لیے

(۹۰)

مرے ناصح مجھے سمجھا رہے ہیں
فریضہ ہے، ادا فرما رہے ہیں

دھواں اُٹھتا ہے اک اک موئے تن سے
سزا اپنے کیے کی پا رہے ہیں

طلسمِ ہستیٔ فانی دکھا کر
ابھی کچھ دیر وہ بہلا رہے ہیں

جہاں سے کل ہمیں آنا پڑا تھا
وہیں مجبور ہو کر جا رہے ہیں

دکھا دیں گے عزیزؔ انجامِ دُنیا
ابھی تو خیر! دھوکا کھا رہے ہیں

(۹۱)

دل ہمارا ہے کہ ہم مائلِ فریاد نہیں
ورنہ کیا ظلم نہیں، کون سی بیداد نہیں

حُسن اک شانِ الٰہی ہے مگر اے بے مہر
بے وفائی تو کوئی حسن خدا داد نہیں

سرِ تربت وہ خموشی پہ مری کہتے ہیں
مرنے والے تجھے پیمانِ وفا یاد نہیں

حسن آراستہ قدرت کا عطیہ ہے مگر
کیا مرا عشقِ جگر سوز خدا داد نہیں

لاکھ پابند علائق نہ رہے کوئی یہاں
طبع وارستہ مگر فکر سے آزاد نہیں

باہم آئینِ وفا رسمِ محبت کیسی،
وقت اب وہ ہے کہ بندوں کو خدا یاد نہیں

چشمِ مخمور! وہ ہے قابلِ غرقِ مے ناب
دفترِ عشق پہ جب تک کہ مرے صاد نہیں

پوچھتے کیا ہو تباہی کا فسانہ مجھ سے
دلِ برباد کی صورت بھی مجھے یاد نہیں

ذرّے ذرّے میں ہے اِک عالمِ معنی پنہاں
خاکِ برباد کو سمجھے ہو کہ آباد نہیں

آپ کہتے ہیں کہ ہے گورِ غریباں ویراں
ایسی بستی تو جہاں میں کوئی آباد نہیں

آنسوؤں کو بھی ذرا دیکھ لے رونے والے
ان ستاروں میں تو دُنیا کوئی آباد نہیں

حسنِ خود بیں نے کیے آئینے کے سو ٹکڑے
اب نہ کہنا کہ نگاہیں ستم ایجاد نہیں

کب خیالات پہ ممکن ہے کسی کا پہرہ
دل تو آزاد رہا، میں اگر آزاد نہیں

سینہ کاوی کے لیے شرط ہے دل کی ہمت
ناخنِ دستِ جنوں تیشۂ فرہاد نہیں

بے خودی منزلِ عرفاں ہے، ذرا ہوش میں آ
ہے خودی کا یہ نتیجہ کہ خدا یاد نہیں

طبقۂ خاک میں ہے عالمِ خاموش آباد
جس کو برباد سمجھتے ہو وہ برباد نہیں

دلِ ویراں کی تباہی کی کوئی حد ہے عزیز
میں سمجھتا ہوں کہ دنیا ابھی آباد نہیں

(۹۲)

تری کوشش ہم اے دل! سعیٔ لاحاصل سمجھتے ہیں
سرِ منزل تجھے بیگانۂ منزل سمجھتے ہیں

حصولِ زندگی جاں دادۂ قاتل سمجھتے ہیں
نہ سر کو سر سمجھتے ہیں نہ دل کو دل سمجھتے ہیں

غریقِ بحرِ اُلفت، آشنائے قلزمِ معنی
جہاں پر ڈوب کر اُبھریں اُسے ساحل سمجھتے ہیں

دیارِ عشق کے ساکن زمیں پر پاؤں کیا رکھیں
یہاں کے ذرّے ذرّے کو حبابِ دل سمجھتے ہیں

کریں کیا اُن سے شکوہ جو کسی کے دل جلانے کو
فروغِ گرمیِ ہنگامۂ محفل سمجھتے ہیں

جھکانا آستاں پر سر کوئی مشکل نہیں لیکن
جبینِ بندگی کو ہم کب اس قابل سمجھتے ہیں

شکستہ دل لیے یہ سوچ کر اس بزم سے نکلا
شکایت کیجیے اُن سے جو دل کو دل سمجھتے ہیں

یہ دل حاضر ہے، بسم اللہ وہ کھولیں گرہ اس کی
اگر آسان حلِ عقدۂ مشکل سمجھتے ہیں

لبِ فریاد اگر کھولوں تو کیا ہنگامہ برپا ہو
خموشی کو مری جب گفتگوئے دل سمجھتے ہیں

وہ خلوت ہو کہ جلوت ہو تجلی ہو کہ تاریکی
جہاں تم ہو اسی کو ہم بھری محفل سمجھتے ہیں

ارادہ ہو تو دل مضبوط کر لے ڈوبنے والے!
جب ایسا وقت ہو دھارے کو بھی ساحل سمجھتے ہیں

دمِ آخر ڈھلکا ہے ایک آنسو دیدۂ تر میں
اسی کو ہستیِ ناکام کا حاصل سمجھتے ہیں

وفا کی حد دکھا کر جلنے والے دل، خدا حافظ!
تجھے بھی اک چراغِ کشتۂ منزل سمجھتے ہیں

مشا ڈالا مجھے، پھر بھی یہ ہے بیداد کی حسرت
ابھی فہرست موجودات میں شامل سمجھتے ہیں

مرا طرزِ سلوک اس راہ کے رہ رو نہ سمجھیں گے
مگر جو راہ بر راہ حق و باطل سمجھتے ہیں

نثارِ دوست ہے یہ موتیوں کا بے بہا مالا
ہر اک آنسو کو ہم ٹوٹا ہوا اک دل سمجھتے ہیں

جنھیں معلوم ہے تیری نگاہ ناز کا عالم
وہ اپنے ضبط کے دعووں کو خود باطل سمجھتے ہیں

عزیز افکارِ دنیا اور مشاغل شعر گوئی کے
احبا کی محبت ہے جو اس قابل سمجھتے ہیں

(۹۳)

کس کس انداز سے ہوتے ہیں وہ پنہاں ہم سے
دیکھ لیتے ہیں مگر آئینہ ساماں ہم سے

تیرہ و تار ہوا قالبِ انساں ہم سے
روح سے ہم ہیں خجل، روح پشیماں ہم سے

نہ بیاباں ہے موافق نہ گلستاں ہم سے
ساز کرلے تو ہی اے گورِ غریباں ہم سے

کعبۂ و دیر کی راہیں ہیں گریزاں ہم سے
کفر آزردہ ہے اسلام پشیماں ہم سے
جادۂ کفر بنائی گئی ہر منزلِ دوست
شکوہ کرتا ہے یہ زنّارِ رگِ جاں ہم سے
تیر کھایا ہے وہ دل پر کہ الٰہی توبہ!
بس ہوا ہے یہی اک کارِ نمایاں ہم سے
آئینہ خانے میں اے زلف بنانے والے!
دیکھے جاتے نہیں اب خوابِ پریشاں ہم سے
بجلیاں ٹوٹ پڑیں گی دلِ بے تاب ابھی
ہل بھی جائے گا اگر پردۂ ایواں ہم سے
صبحِ محشر ہو بپا، ظلمتِ دُنیا چھنٹ لے
کیوں چھڑاتے ہو ابھی گوشۂ داماں ہم سے
خونِ گل رنگ بہا دیدۂ تر سے کشفؔ
بارہا فاش ہوا رازِ گلستاں ہم سے
زندگی کٹ گئی جلتے ہوئے، شعلہ نہ اُٹھا
سوزِ دل سیکھ لے اے شمعِ شبستاں ہم سے
چشمِ ساقی سے نکلتی ہے نگہ یہ کہہ کر
ہے کوئی ساغرِ لب ریز کا خواہاں ہم سے

نہ چلا فطرتِ مجبور پہ قابو نہ چلا
آہ! پامال ہوئی رفعتِ انساں ہم سے

ضبطِ وحشت کا زمانہ نہیں، دشوار ہے اب
خندۂ زیرِ لب و گریۂ پنہاں ہم سے

کیا کریں، کس سے کریں دل کی تباہی کا گلہ
اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں ہوا ویراں ہم سے

ہیں خس و خارِ نشیمن میں بہت کچھ دعوے
کے ملائیں تو نواسنج گلستاں ہم سے

سانس لینے میں اب اُڑتی ہیں لہو کی چھینٹیں
کیا چھپائے سے چھپے کاوشِ مژگاں ہم سے

پھونک دے سوزِ نہاں پیکرِ خاکی اتنا
کوئی ذرّہ نہ ہو آلودۂ عصیاں ہم سے

یہ صدا دیتے ہوئے تا درِ رحمت پہنچے
مول لے گا کوئی سرمایۂ عصیاں ہم سے

آنکھیں پتھرا گئیں کیوں، کس کی تجلّی دیکھی
کچھ بتاتے ہی نہیں دیدۂ حیراں ہم سے

یادِ ایامِ طرب خیز کہ زندہ تھے عزیزؔ
کم تھے اس مے کدے میں مست و غزل خواں ہم سے

(۹۴)

قدرت ہے تو پھر کیوں کوئی دیوانہ بنا دے
دھوکا ہو اسی کا مجھے ایسا نہ بنا دے
تیرا ہوں تو کونین سے بیگانہ بنا دے
افسانہ بنا دے مجھے افسانہ بنا دے
پھونک آتشِ الفت میں کوئی روح شرر بیز
ہر شعلہ جاں سوز کو پروانہ بنا دے
جلوہ وہ دکھا جس کی حقیقت نہ کھلے کچھ
ہر محرمِ اسرار کو بیگانہ بنا دے
یہ قدرتِ انشا تری اے برقِ تجلی!
اک سطر سنہری اسے افسانہ بنا دے
لکھنا ہے مجھے سوزِ محبت کا صحیفہ
چھوٹی سی بیاض اے پرِ پروانہ بنا دے
کیوں شمع نفس سوختہ بن بزم جہاں میں
ممکن ہو تو ہر سانس کو افسانہ بنا دے
یارب اسی صورت سے مری عمر بسر ہو
جب ہوش ذرا آئے وہ دیوانہ بنا دے

ساقی سے کہو کاسۂ گردوں کو جھکا کر
رندانِ بلا نوش کا پیمانہ بنا دے

ارمان بھرے دل نے ستایا ہے بہت اب
بستی کو مری لوٹ کے ویرانہ بنا دے

بے پردہ نکل آئے تو کیا حشر بپا ہو
پردے میں یہ عالم ہے کہ دیوانہ بنا دے

رکھتا ہی نہیں پاؤں زمیں پر کوئی ورنہ
ہر نقشِ کفِ پا کو صنم خانہ بنا دے

اندازۂ مستی تری نظروں میں رہے کچھ
ہر تارِ نگہ کو خطِ پیمانہ بنا دے

یا پردۂ اسرارِ حقیقت سے نکل آ
یا کعبہ کو تو پھر سے صنم خانہ بنا دے

جب دل کو نہیں ماتمِ احباب سے فرصت
بہتر ہے اب اس دل کو عزا خانہ بنا دے

خاکِ دلِ سوزاں سے اُڑے جب کوئی ذرّہ
اعجازِ محبت اسے پروانہ بنا دے

کافی ہے عزیزؔ اک نگہِ مست کسی کی
چاہے تو دو عالم کو طرب خانہ بنا دے

(۹۵)

جو نہ سمجھے، فائدہ ایسے کے سمجھانے سے کیا
مدعا آخر بتاؤ تم کو دیوانے سے کیا
فائدہ دیوانگی میں اس کو سمجھانے سے کیا
ضبط کی پابندیاں ممکن ہیں دیوانے سے کیا؟
تو نہاں ہے یا عیاں، یہ عقدہ سلجھا دے ذرا
اے حجاب آرا ملے گا میرے اُلجھانے سے کیا
عقدۂ دل کھولو یا دل کی پریشانی مٹاؤ
بال بکھرانے سے کیا اور زلف سلجھانے سے کیا
ہوں شہیدِ کس مپرسی اور قتیلِ بے کسی
شور ماتم کا اُٹھے میرے عزا خانے سے کیا
واعظِ شیریں سخن جب پر نہ خود عامل ہو تو
فائدہ منبر پہ ایسے وعظ فرمانے سے کیا
ساقیا! شامل نہ ہو جس میں ترا کیفِ نگاہ
کام مے خواروں کا نکلے ایسے پیمانے سے کیا
آنکھ جب ساقی نے پھیری، جام چھلکا عمر کا
زندگی کا راز وابستہ تھا پیمانے سے کیا

ذرّہ ذرّہ تھا مرا عیش و طرب کی داستاں
سننے والے سُن، صدا آتی ہے ویرانے سے کیا

طور جل کر خاک ہو، بے ہوش ہوں اہلِ نظر
فائدہ اس طرح آخر آنکھ جھپکانے سے کیا

عشق نے برباد کر ڈالیں ہزاروں ہستیاں
کوئی ٹکڑا لے گیا ہے میرے افسانے سے کیا

ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے جب ہماری داستاں
اب چھپائیں رازِ دل ہم اپنے بیگانے سے کیا

پھاند پڑنا آگ میں سمجھا ہے معمولی سا کام
کہہ دیا ہے شمع کے شعلے نے پروانے سے کیا

گھُٹ رہا ہوں اضطرابِ شوق ہی میں دیر سے
دیکھ تو ساقی دھواں اُٹھتا ہے پیمانے سے کیا

گوشۂ خلوت ہے اور سیرِ دو عالم ہے عزیزؔ
کیا بتائیں لطف ملتا ہے کتب خانے سے کیا

(۹۶)

حسنِ یوسف مشتعل تھا جرأتِ تقصیر پر
کیوں اُبھر آئے نہ چھالے دستِ دامن گیر پر

کیا اُمید اُس کی کہ نادم ہو کسی تقصیر پر
وہ نگاہِ شوخ جس نے تیر مارے تیر پر

سچ تو یہ ہے زندگی ہم سے گنہ گاروں کی کیا
چند دھبے ہیں بساطِ خاکِ دامن گیر پر

اس زمیں میں دیکھ تجھ ایسے ہزاروں دفن ہیں
ناز اے منعم نہ کرنا خاک کی تعمیر پر

طرۂ شب رنگ نے بل کھا کے خوابِ ناز میں
کچھ اضافہ کر دیا وابستۂ زنجیر پر

تیشۂ فرہاد ہمت پر تری صد آفریں
جوئے خوں جاری کرے گا کون جوئے شیر پر

مختلف ہوتی ہیں تاثیریں نگاہِ شوق کی
ڈال دو اک اور پردہ پردۂ تصویر پر

فاش ہو رازِ حقیقت پھر کروں گا میں سلام
یوں تو ہے اجماعِ عالم کا مری تکفیر پر

ہے نگاہِ ناز پر اُن کو عزیز اتنا غرور
جیسے یہ دُنیا تھمی ہے ایک نوکِ تیر پر

(۶۸)

التفات اُس سے ناشناسی ہے
بزمِ دُنیا فقط قیاسی ہے

اس کے آگے جو بد حواسی ہے
انتہائے ادا شناسی ہے

اپنی ہستی سے باخبر، غافل!
خود شناسی خدا شناسی ہے

دوست دشمن میں امتیاز نہیں
اب ہماری یہ بدحواسی ہے

اُس رُخِ بے نقاب کے آگے
جو گُلِ تازہ ہے وہ باسی ہے

زندگی اور کوئے قاتل میں
یہ زمیں تو لہو کی پیاسی ہے

ٹوٹ جائے تری نگہ سے اگر
آئینے کی ادا شناسی ہے

کثرتِ جلوہ ہائے رنگا رنگ
امتحانِ اَدا شناسی ہے

وقتِ عرضِ ہنر نہیں باقی
ہر طرف دَورِ ناشناسی ہے

مَر کے بھی احتیاجِ خلعتِ نَو
اب بھی ارمانِ خوش لباسی ہے

تم بھی چہرہ عزیز کا دیکھو
الاماں! کس قدر اُداسی ہے

(۹۸)

آؤں نہ پلٹ کر تو مجھے لاکھ صدا دے
محفل سے اُٹھانا ہے تو اس طرح اُٹھا دے

اس نقش نے تجھ سے مجھے بیگانہ بنایا
احسان کر اتنا، مری ہستی کو مٹا دے

نیرنگیِ دُنیا سے نہ کھانے کوئی دھوکا
یہ نقش ہے، باطل، تو اسے جلد مٹا دے

اب دیر نہ کر، دل کے ارادے ہیں بہت کچھ
ہاں ہاں! جو مٹانا ہے اُسے جلد مٹا دے
پھر دیکھ تماشا کہ اُبھرتا ہوں میں کیونکر
جتنا تجھے منظور مٹانا ہو، مٹا دے
پیمانہ بکف رند ہیں، چھائی ہیں گھٹائیں
ساقی سے کہو، قلزمِ ذخار بہا دے
دم لے گی کہیں آہِ دروں تاب کسی کی
کونین کو جب تک کہ نہ افسانا بنا دے
اِک آہ میں دُنیا کا بدل جائے گا نقشہ
دل، میرا کہا مان کہ یہ آگ دبا دے
غیروں کو مری ہستیٔ پُر مایہ پہ ہو رشک
اے دل! کہیں دردِ ابدی تجھ کو خدا دے
یہ گرمیٔ محفل ہے تری ذات پہ موقوف
ہاں آتشِ دل، اور کوئی شعلہ بڑھا دے
اندازِ تغافل، اَرِنی گو سے کہاں تک
یہ رسم پرانی ہے بہت، اس کو اُٹھا دے
ہر آبلۂ پا میں عزیز ایسی تپک ہے
ڈرتا ہوں کہ بن میں نہ کہیں آگ لگا دے

(٩٩)

صاف باطن دیر سے ہیں منتظر　　ساقیا! خذ ما صفا، دع ما کدر
پھر حیاتِ چند روزہ کا مآل!　　موت پر جب زندگی ہے منحصر
رُت بدلتے ہی فضا میں گونج اُٹھا　　نغمۂ یا ایہا السّاقی اَدر
ایسے وادی میں بنیں کیا رہ نما　　خود جہاں گم کردہ منزل ہوں خضر
مشورہ رحمت سے کرلے عدلِ حق　　کیا سزا جو ہو خطا کا خود مقر
کیوں ہے اسرارِ دو عالم کی تلاش　　پردۂ دل میں ہیں تیرے مستتر
کیوں مری دیوانگی بدنام ہے　　اُن کی آنکھیں خود ہوئیں جب مشتہر
الحذر! پیرِ فلک کی سرکشی　　دیکھنے میں تو ہے اتنا منکسر
کھو چکا آنکھیں، مگر اے برقِ حسن　　دل رہے گا اور رہے گا منتظر

سُن لے فریادِ عزیزِ جاں بلب
ربِّ انّی مستغیث فانتصر

(١٠٠)

٢٤ اکتوبر ١٩٣١ء

حُسنِ عالم سوز نامحدود ہونا چاہیے
ہر تجلّی آفتاب آلود ہونا چاہیے
حُسنِ نیّت ہے دلیلِ حُسنِ انجامِ عمل
سعی میں بھی جلوۂ مقصود ہونا چاہیے

ایک ہی جلوہ ہے جب ہنگامہ آرائے شہود
پھر وہی شاہد وہی مشہود ہونا چاہیے

حُسنِ عالم سوز کا فیضِ تجلّی عام ہے
ایک اک ذرہ یہاں مسجود ہونا چاہیے

شانۂ و آئینہ کیا، اے زلفِ مشکینِ ایاز
تیری زینت کو دلِ محمودؔ ہونا چاہیے

بے نیازی! اب خطا کاروں کی ہمت بڑھ گئی
بابِ توبہ کچھ دنوں مسدود ہونا چاہیے

کاوشِ مژگاں کا پیہم یہ تقاضا ہے عزیزؔ
ہر نفس کو تیر کے خون آلود ہونا چاہیے

(۱۰۱)

مے کشوں کو مے کشی پر ناز ہونا چاہیے
یوں درِ مے خانہ ساقی باز ہونا چاہیے

داد خواہی حشر میں ہم کس توقع پر کریں
کوئی تو اِن میں ہم آواز ہونا چاہیے

داستانِ عمرِ رفتہ سننے بیٹھا ہے کوئی
پھر سے دَورِ زندگی آغاز ہونا چاہیے

ختم پر آئی ہے میری داستانِ زندگی
اب تمھیں بھی گوش بر آواز ہونا چاہیے

اب ہوا اس گلشنِ ایجاد کی ناساز ہے
ہم صفیرو! مائلِ پرواز ہونا چاہیے

ہم صفیرانِ چمن سب اُڑتے جاتے ہیں عزیزؔ
اب ہمیں بھی مائلِ پرواز ہونا چاہیے

(۱۰۲)

جلوہ گہ میں یہ بے خودی کیا ہے
پردہ اُٹھنے تو دو، ابھی کیا ہے

دیکھ لے تجھ کو اک نظر کوئی
چشمِ تر! خون کی کمی کیا ہے

اسی جینے پہ لوگ مرتے ہیں
اک تلاطم ہے زندگی کیا ہے

صرف ان کا وصال ان کا فراق
بے خودی کیا ہے اور خودی کیا ہے

(۱۰۳)

نام ہی کو فقط حیات رہی
اب نہ وہ دن رہے نہ رات رہی

رُخ کے جلوے ہوئے حجاب افگن
وصل میں بھی انھیں کی بات رہی

رفتہ رفتہ فنا ہوئی دُنیا
صرف باقی اُنھی کی ذات رہی

سینے پر زخم، دل میں اک ناسور
اب یہ لے دے کے کائنات رہی

دیکھیے کیا دکھائے بختِ عزیزؔ
اور کچھ دن اگر حیات رہی

۱۰۴

۱۶ر فروری ۱۹۲۳ء

حصارِ ظلم و قلبِ ناتواں ہے — نظر تک آسماں ہی آسماں ہے
مرے اور اُن کے فصل اتنا کہاں ہے — تجلی ہی تجلی درمیاں ہے
بہ ظاہر ہے، بہ باطن بے نشاں ہے — یہ دُنیا داستاں ہی داستاں ہے
دلِ گم کردہ منزل بے نشاں ہے — ذرا آواز تو دینا کہاں ہے
سنبھل کر کوچۂ جاناں کے رہرو — یہاں کا ذرّہ ذرہ آسماں ہے
تلاطم خیز موجیں اُٹھ رہی ہیں — شکستہ کشتیٔ عمرِ رواں ہے
ہوا میں اُڑ رہے ہیں خس کے تنکے — یہی شاید ہمارا آشیاں ہے
نشیمن تک مرا ویرانگی میں — ہوا کے دوش پر بارِ گراں ہے
گزشتہ عیش کا نقشہ ہے آگے — قفس جب سے قریبِ آشیاں ہے
نہ پوچھو منزلِ گم کردہ منزل — جہاں بیٹھوں وہیں پر آشیاں ہے
چمن ہے اور وہ خورشید سیما — بہارِ زندگانی بے خزاں ہے
خدا جانے کہوں کیا اس کے آگے — مرے کہنے میں کب میری زباں ہے
اگر وہ رخصتِ فریاد دے دے — زمیں پھر ہے نہ دورِ آسماں ہے
نہ دے موقع کہ نالہ کوئی کھینچوں — ستم گر! یہ دکھے دل کی فغاں ہے
گرا تھا طور پر جو برق بن کر — وہی تنکا بنائے آشیاں ہے
مری پرواز سے واقف نہیں وہ — مجھے گھیرے ہوئے کیوں آسماں ہے

یہ اوراقِ پریشاں دیدنی ہیں ہر اک گُل داستانِ درد استاں ہے

عزیزؔ اب کچھ نہیں قابو زباں پر
قریبِ ختم شاید داستاں ہے

(۱۰۵)

قدم رکھّا الٰہی کس چمن آرائے فطرت نے
اُداسی پھُول برسانے لگی گورِ غریباں پر
جب آبروئے زلیخا پر شکن پیدا ہوئی غم سے
چمک اٹھا ہلالِ یک شبہ تاریک زنداں پر
طلسمِ رازِ کُن کا ٹوٹنا حسنِ حجاب آرا!
فقط تھا منحصر آوازۂ چاکِ گریباں پر
اُداسی اب کسی کا رنگ جمنے ہی نہیں دیتی
کہاں تک پھول برسائے کوئی گورِ غریباں پر
تلافی اِک لہو کی بوند کی بھی ہو نہیں سکتی
ہزاروں سال روئے ابر اگر خاکِ شہیداں پر
لہو دل کا عزیزؔ اب رائگاں کرنے سے کیا حاصل
لکھے جاتا ہوں اپنے تجربے دیوارِ زنداں پر

یہ مختصر شبِ فرقت کی داستاں سُن لو
کہ روزِ حشر پہ صرف ایک رات بھاری تھی

تمام عمر جلا اور کبھی دھواں نہ اُٹھا
یہ کیسا راز تھا یہ کیسی راز داری تھی

بس ایک شمع کا شرمندہ تھا مزارِ عزیزؔ
نہ سوگوار تھا کوئی نہ سوگواری تھی

سکون جب نہ دلِ بے قرار پیدا ہو
نگاہِ عشق میں خاک اعتبار پیدا ہو

یہ خونِ دل ہے، کبھی رائگاں نہیں جاتا
جہاں بھی بیٹھ کے روؤں، بہار پیدا ہو

بھری ہے عشق نے دل میں عزیزؔ ایسی ہوا
جو سانس لوں تو نسیمِ بہار پیدا ہو

دل نہیں اب قابلِ غم خوارگی اُف مری مجبوری و بیچارگی
دیکھیے اب ہم کو لے جائے کہاں اے دلِ ویراں! تری ویرانگی

لفظِ حیات کا کوئی پھر مدعا نہ ہو
تم میری زندگی کا اگر آسرا نہ ہو

اتنی سی بات پر تمھیں غصّہ ہی آگیا
جاتا ہوں بزمِ ناز سے اچھا خفا نہ ہو

مایوس اس کی بزم سے اُٹھا ہوں اس طرح
جیسے کسی شکستہ جگر کا خدا نہ ہو

کیوں بند کی ہیں آنکھیں، کھلنا محال جن کا
کیا دیکھتے چمن کو اس خوں چکاں نظر سے

یاد رکھنا ہم کو اے آئندگانِ رفتنی
اس چمن میں تھا ہمارا آشیانہ بھی کبھی

آج خوش ہولیں ہماری موت پر لیکن عزیز
خون رو لوئے گا ان کو یہ فسانہ بھی کبھی

نہ رہتا درد اگر دل میں برابر تکلّف پھر ہمیں جینے میں ہوتا

خاک زندہ رہ سکیں یہ سختیاں جھیلے ہوئے
مل گئے مٹّی میں اپنے ساتھ کے کھیلے ہوئے

جن کے سر پہ جگمگاتا تھا کبھی تاج شہی
آج اُنہی کے کاسۂ سر خاک کے ڈھیلے ہوئے

ہر نقش ہے ثبوت مصوّر کی ذات کا
ہر ذرّہ اک دلیل وجودِ خدا کی ہے

وہ اور میرے حال پہ یوں مہربان ہوں
میں اور اُن کی بزم میں قدرت خدا کی ہے

کسی سے یہ بھی نہ تو نے پوچھا کہ رات کیونکر بسر ہوئی ہے
سپید چادر اُڑھانے والے کہیں بھی ایسی سحر ہوئی ہے
طبیب سمجھے ہیں زخم کاری، یہاں ہے منظور راز داری
کسی سے کہتے نہیں یہ بنتا، جگر کے پار اک نظر ہوئی ہے

میرے مرض کی شان یہ، زیست کا آسرا نہیں
چارہ گروں کی کوششیں، جس کی کچھ انتہا نہیں
کون و مکاں سے واسطا، عرشِ بریں سے مدّعا
دل میں اگر خدا نہیں، پھر تو کہیں خدا نہیں

خراب ہوں اُسی چشم سیاہ کے پیچھے — قیامتیں ہیں جہاں ہر نگاہ کے پیچھے
زمیں پہ پاؤں کیوں کر کوئی رکھے — یہ فرشِ خاک اس قابل کہاں ہے

ظاہرا بے ہوش، باطن میں سراپا ہوش ہوں
دیکھتا جاتا ہوں رنگِ محفل اور خاموش ہوں

مرا دل ہے محوِ ادائے خموشی — جہاں گرم ہنگامۂ خود فروشی
مدت ہوئی کہ دل رہ الفت میں کھو چکے — ہم اپنی یادگار کو پہلے ہی رو چکے

ہائے! اس سینۂ پر داغ میں کیا کیا ہو گا
آرزو ہائے جواں مرگ کا مدفن دیکھو

نہیں ملتا ہے دم بھر چین اب ہر وقت روتے ہیں،
یہی دل ہے تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھوتے ہیں

ہر جگہ دُنیا میں بند و بست ہیں　　اپنے اپنے حال میں سب مست ہیں
ہم کو ہلاک حسرتِ دیدار نے کیا　　جو کچھ کیا وہ وہمِ غلط کار نے کیا
اگر میں نہ ہوں گا مرا غم رہے گا　　مرے بعد تا دیر ماتم رہے گا

کچھ اس طرح مرے دل نے مجھے اُداس کیا
کہ سب نے زیست میں مردہ مجھے قیاس کیا

بہت کچھ آہ میں صرفہ تھا ضبطِ پنہاں کا
خدا گواہ کہ پھر بھی تمہارا پاس کیا

ترے حُسنِ دل کش میں کیا روپ ہے
زمیں تپ رہی ہے کڑی دھوپ ہے

زمانے کو ساتھ اپنے میں لے گیا　　گیا آپ سے جو وہ جگ سے گیا

مانا کہ خود بخود ہے زمانے کا انتظام
ہم اپنے اختیار میں پھر بھی نہیں رہے

وہ اک بات جو دل میں برسوں سے تھی　　خفا ہو گئے وہ تو کہنا پڑی
کچھ تو دل کو قرار ہو جاتا　　عہد پر اختیار ہو جاتا

مجھے بھی شکل دکھانا تھی اُن کی صورت میں
کسی کو خاک کے پتلوں کا اعتبار نہیں

اصل میں دیکھو تو ہوں وجہ بنائے کائنات
دیکھنے میں خاک کے دامن کا اک پیوند ہوں

راہ بر سے بھی دل نہیں ہے صاف
اب تو ہر بات پر کھٹکتا ہوں

کوئی ہمدردی کہاں تک کر سکے
پوچھنے والے بھی اب اکتا گئے

مدّت ہوئی کہ سینے میں وہ دل نہیں رہا
اب میں کسی سے ملنے کے قابل نہیں رہا

اے مرا حال پوچھنے والے!
تیرا چہرہ نظر نہیں آتا

اب جو عالم ہے اُسے کس چیز سے تشبیہ دوں
غم تو میرے ابتدائے عشق کی تصویر ہے

نیک و بد اپنا جانتا ہی نہیں
دل کسی طرح مانتا ہی نہیں

پہنچ کر جلوہ گاہِ حسن میں ایسا ہوا سکتا
کہ جنبش کر نہیں سکتا ہوں، آنسو رک نہیں سکتا

تیری رعنائی قامت دیکھی
اپنی آنکھوں سے قیامت دیکھی

مجھ پہ کیوں غصہ ہے حُسنِ فتنہ گر کو دیکھیے
میرے دل نے کیا کیا، اپنی نظر کو دیکھیے

عالم ہستی میں آ کر سخت گھبرایا ہوں میں
کیسا ہنگامہ ہے یارب یہ کہاں آیا ہوں میں

سخت مجرم لائق صد جور ہوں
یہ عنایت ہے کہ زیر غور ہوں

دیکھ کر آئینہ کہتا ہوں عزیز
میں وہی ہوں یا کوئی اب اور ہوں

میں حال دل اپنا کہہ رہا ہوں
یہ کون سی بات ہے ہنسی کی

تنگ اب جینے کی راہیں ہو گئیں
جتنی سانسیں تھیں وہ آہیں ہو گئیں

مرثیہ

بر وفاتِ اُستاذ المعظم حضرتِ عزیز لکھنوی

اعلی اللہ مقامہٗ

از

آثر لکھنوی

مرثیہ

دلِ حزیں پہ چھری چل گئی یہ سنتے ہی
عزیز اُٹھ گئے دُنیا سے راہِ جنت لی
یہ مرنے والے کو تم سے اثر محبت تھی
کہ فکر اپنی تھی اور کچھ نہ اپنے بچوں کی
اگرچہ ضعف سے کب گفتگو کا یارا تھا
زباں پہ نام دمِ مرگ بھی تمھارا تھا

جو آرزو تھی تو وہ آرزو تمھاری تھی
جو گفتگو تھی تو وہ گفتگو تمھاری تھی
پلٹتی پتلیوں کو جستجو تمھاری تھی
نہیں تھے شکل مگر روبرو تمھاری تھی
عزیز اور اقارب سے پھیر لیں آنکھیں
کہا بس "آہ اثر" اور بند کیں آنکھیں

کہاں میں ڈھونڈھنے جاؤں تمہیں عزیز عزیز
قدم نہ چھوڑوں جو پاؤں تمہیں عزیز عزیز
خفا ہو؟ آؤ مناؤں تمہیں عزیز عزیز
پھر اپنا حال سناؤں تمہیں عزیز عزیز
اسی سے کھنچتے ہو عاشق ہو جس کی صورت کے
تمہیں پہ ختم یہ انداز ہیں محبت کے
عزیز تم نہ کبھی ایسے بے مروت تھے
وفا کے پتلے تھے، خوش خلق و پاک طینت تھے
زمانہ آنکھیں بچھاتا وہ نیک سیرت تھے
قناعت ایسی کہ مرعوب اہل دولت تھے
اثر کو ناز تھا، ہے اس کا قدرداں تم سا
سلوک ایسا کرے اس سے مہرباں تم سا
کرو تو یاد کہ آپس میں پینگ کیسے تھے
غلط ہے کیا کہ لڑکپن کے ملنے والے تھے
تمہارے شعروں پہ ہم تبصرہ جو کرتے تھے
ہماری فہم و ذکاوت کی داد دیتے تھے
اسی کے ساتھ تنقید تھی مشاعری بھی کرد
یہ مشغلہ بھی رہے، فکر روزی کی بھی کرد

غزل کہی اُسے اصلاح دے کے چمکایا
مشاعروں میں لیا ساتھ اور پڑھوایا
اُبھار اُبھار کے آخر ہواؤ کھلوایا
تمہارے فیضِ تلمذ سے نام اثر پایا

گلے لگا لو، اِدھر دیکھو، دل کو صاف کرو
مری خطا جو ہو للّٰلہ وہ معاف کرو
مگر ہو تم بھی تو مجبور بس اجل سے کیا
مٹا کے رکھ دیے ظالم نے شیوہ ہائے وفا

حیات و مرگ میں وقفہ ہی کتنا، دم بھر کا
اگر کشش ہے محبت میں ہو گا پھر ملنا
تمھاری یاد ہے باقی، کلام باقی ہے
تمہارے نام سے اپنا بھی نام باقی ہے

رموزِ حسن و محبت کا آشنا تھا عزیز
وفا کو ناز تھا جس پر وہ باوفا تھا عزیز
سرشت جس کی صفا تھی وہ باصفا تھا عزیز
غیور و سالکِ سرمنزلِ رضا تھا عزیز

عزیز کشورِ معنی تھا فن میں یکتا تھا
" لسان ہند " کا اس کو خطاب پھبتا تھا

خیال و نطق کی باہم وہ کار فرمائی
ادا کی ندرتیں اور ندرتوں میں گہرائی
وہ چست بندشیں اسلوب کی وہ رعنائی
کمال آپ محاکات کا تھا شیدائی

ہزار حیف ! چمن ساز رنگ و بو نہ رہا
عزیز نکتہ سرا فخر لکھنؤ نہ رہا

انوکھے طرز کی وہ نغمہ خوانیاں نہ رہیں
چمن کی زیب جو تھیں گل فشانیاں نہ رہیں
وہ حسن و عشق کی رنگیں کہانیاں نہ رہیں
خطا معاف ! وہ شیوا بیانیاں نہ رہیں

مناسبت تھی عجب طبع کو سخن کے ساتھ
کہیں جو سادگی بھی تھی تو بانکپن کے ساتھ

کھلے وہ نازک و دلکش سخن کے گل بوٹے
ستارے جن کے نظارے کو چرخ سے ٹوٹے
نگاہ اہل ہنر نے ہیں وہ مزے لوٹے
محال ہے کہ یہ چسکا زباں سے چھوٹے

وہ باغباں جو نہیں "گلکدہ" تو باقی ہے
اثرؔ سے پوچھو کہ وہ دل زدہ تو باقی ہے

سب اہل ذوق افادات کے ہیں شیدائی
سُنا نہیں کہ طبیعت پہ بے خودی چھائی
ہجومِ ثابت و سیار ہو تماشائی
فلک کے دل میں رہے حسرتِ جبیں سائی
"صحیفہ ولا" اس کا جو آفتاب پڑھے
تو مہ سپہر کی زرّیں نہ پھر کتاب پڑھے

۱۹۳۵ء